کیا اسلام سائنسی مذہب ہے؟

سائنسی طریقہ علم کا اسلامی جائزہ

محمد زاہد صدیق مغل

مولوی سید محبوب الحسن

[مدت دراز سے بعض اسلامی مفکرین نے سائنس کی اسلامی توجیہات پیش کرنا اپنا مشن بنا رکھا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ شاید یہ دنیا کا واحد مشن ہے جس کے علمبردار اس کے مافیہ اور مالہ تک سے ناواقف ہیں۔ سائنسی علم کی حقیقت جاننے کے لیے کوئی معتبر کتاب پڑھے بغیر ہی اسلام اور سائنس پر ایسی ایسی کتابیں تحریر کردی گئیں کہ انسان ورطہ حیرت میں ڈوب کر سوچتا ہے کہ اگر تحقیق اسی کا نام ہے تو ہم اب تک خاموش کیوں تھے۔ ایسی کتابوں میں علامہ طنطاوی کی ''جواہر القرآن'' ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی دو قرآن اور میری آخری کتاب شہاب الدین ندویؒ اور ذاکر نائیک صاحب کی کتابیں اور وحید الدین خان کی علم جدید کا چیلنج اور عقلیات اسلام، وغیرہ سرفہرست ہیں۔ زیر نظر مضمون میں ہم ایسے حضرات کے ان خیالات وافکار کا تنقیدی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے جو انھوں نے محض سائنس سے مرعوبیت کی بنا پر اپنا رکھے ہیں۔ چونکہ یہ مضمون سائنس کے حوالے سے پائے جانے والے عام تاثر پر نقد پیش کرے گا، لہٰذا اگر قارئین کرام کو مضمون کے مندرجات سے اختلاف ہو یا کوئی سوالات و اشکالات ہوں تو بذریعہ خط یا ای میل ہمیں مطلع کریں، ہم جواب دینے کی کوشش کریں گے۔ یہ بات واضح رہے کہ اسلام میں علوم عقلیہ اور علوم نقلیہ کی تقسیم ہے اور حقیقت کا ادراک صرف علوم نقلیہ سے ممکن ہے، علوم عقلیہ محض معاد کے معاون کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ العظیم: ہمارا ای میل ایڈریس ہے:zahid_12feb@yahoo.com]

F:\Shah\November 2006\SCIENCE_AND_ISLAM_for_Sahil

وضاحت:

اس مضمون میں سائنس کے تصور حقیقت پر لفظ 'حقیقت' اور سائنس کے تصور علم پر لفظ 'علم' کا اطلاق صرف اردو زبان میں نفس مضمون کو بیان کرنے کے لیے کیا گیا ہے، ورنہ یہ بات یاد رہے کہ حقیقت اور علم محض ایک ہے اور وہی ہے جسے اسلام حقیقت اور علم کہتا ہے، جس چیز کو سائنس حقیقت اور علم کہتی ہے وہ سوائے جھوٹ، فریب اور کفر کے اور کچھ بھی نہیں

ساحل کے اگست ۲۰۰۶ کے شمارے میں ہم نے سائنسی طریقہ علم [scientific method of knowledge] کی وہ تشریحات وتوجیہات جو مغربی مفکرین نے پیش کی ہیں اس کی ایک تلخیص پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہاں ہم برسبیل تذکرہ ایک جامع خلاصہ بیان کیے دیتے ہیں۔ ہمارے پچھلے مضمون کے مطابق سائنس کے چار بڑے فرقے ہیں یعنی اس سوال کہ 'سائنسی نظریات کا ارتقاء کیسے ہوتا ہے' کے جواب میں مفکرین سائنس درج ذیل چار بڑے گروہوں میں تقسیم ہوگئے ہیں:

۱] فرقہ استقرائیت [Inductivism] اس فرقے کے مطابق سائنسی علم کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ ہے، یعنی انسانی حواس کے ذریعے حاصل ہونے والے انفرادی نوعیت کے تجربات [singular propositions] کی بنیاد پر ایسے آفاقی نظریات [Universal propositions] کی تعمیر کرنا ممکن ہے جنکی مدد سے حوادثات عالم کی تشریح و پیشن گوئی کی جاسکے۔ اس نظریئے کے مطابق سائنس کا مقصد نظریات کو ثابت کرنا ہے۔

۲] فرقہ تردیدیت [falsificationism]: چونکہ کسی نظریئے کے بغیر تجربہ اور مشاہدہ ممکن العمل ہی نہیں نیز کسی نظریئے کا اثبات منطقی اعتبار سے ناممکن الوقوع ہے، لہذا اس فرقے کے مطابق سائنسی علم کی بنیاد ایسے نظریات ہیں جو تجربے کی روشنی میں غلط ثابت کیے جاسکتے ہوں۔ اس فرقے کے مطابق سائنسی نالج کی تعمیر نظریات کو غلط ثابت کرنے سے ہوتی ہے اور سائنس نفی کے اصول پر آگے بڑھتی ہے۔ سائنس کا یہی نظریہ زیادہ تر یونیورسٹیوں میں قبولیت عام کا حامل ہے۔

۳] فرقہ ساختیت [Structuralists]: چونکہ عقلاً تجربے کی روشنی میں کسی نظریئے کا حتمی اثبات و ابطال ممکن نہیں، لہذا اس فرقے کے مطابق ہر مضمون [Discipline] میں سائنسی علم کی تعمیر چند خاص مابعد الطبعیاتی حقائق کے ماتحت روبہ عمل ہوتی ہے جسے اس مضمون کا خاص تحقیقی منہاج [Paradigm یا Structure] کہا جاتا ہے۔ جب کوئی ایسا تجربہ مشاہدے میں آئے جو پیر منہاج علم کے واضح اصولوں سے ٹکراتا ہو تو سائنس دان مختلف قسم کے اضافی نظریات [جنہیں اس پیراڈائیم کے auxiliary hypothesis یا Protective Belts کہا جاتا ہے] قائم کرتے ہیں جن کا مقصد منہاج کے

اصولوں میں رہتے ہوئے ایسے تجربات کی تشریح کو ممکن بنانا ہوتا ہے۔ کسی پختہ [Mature] سائنس میں اپنی خاص منہاج پر تنقید کرنے کی اجازت نہیں ہوتی البتہ جب کسی وجہ سے سائنس دانوں کا کسی منہاج کے مابعد الطبعیاتی حقائق پر سے ایمان ختم ہو جاتا ہے تو اس کی جگہ ایک دوسری منہاج لے لیتی ہے جو نئے قسم کے ایمانیات پر مشتمل ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر دوسری صورت میں کسی مضمون میں تعمیر ہونے والا سائنسی علم چند مابعد الطبعیاتی حقائق پر ایمان کا مرہون منت ہوتا ہے۔

۴] فرقہ انارکسٹ [Anarchists]: چونکہ ہر سائنسی علم کی بنیاد چند مابعدالطبعیاتی حقائق پر ایمان لانے پر منحصر ہے، لہذا سائنسی علم کو کسی خاص ڈھانچے [Structure] کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ نیز کسی خاص سائنسی طریقہ سے حاصل ہونے والی معلومات کو کسی دوسرے طریقہ سے حاصل ہونے والی معلومات پر فوقیت دینے کے لیے کوئی عقلی دلیل نہیں ہوسکتی۔ مزید یہ کہ مغرب میں سائنسی معلومات کی برتری کا راز خود سائنس کے طریقہ کے تجزیے سے نہیں بلکہ ان معاشرتی وتہذیبی تبدیلیوں کے پس منظر میں ہی سمجھا جا سکتا ہے جو سترہویں اوراٹھارویں صدی عیسوی کے یورپ میں رونما ہوئیں۔

اس مضمون کو تحریر کرنے کا مقصد ان خطرات اور گمراہیوں کا جائزہ لینا ہے جو اسلام کی سائنسی تعبیرات پیش کرنے نیز سائنس کو اسلامیانے کے ضمن میں پائی جاتی ہیں۔ ان خطرات اور گمراہیوں سے آ گاہی اس لیے ضروری ہے کہ یہ ایک مومن کے ایمان کا معاملہ ہے جو اس کے لیے ہر قیمتی شے سے زیادہ اہم تر متاع ہے۔ ان گمراہیوں کے فہم کے لیے ضروری ہے کہ آپ وہ پس منظر اپنے سامنے رکھیں جو مغربی مفکرین کی مذہبی عقلیت کے حوالے سے فکری بے اطمینانی کے ضمن میں ہم نے اپنے پچھلے مضمون میں بیان کیا تھا۔

سائنسی تصور علم [Scientific Method of Knowledge]: ان مفکرین کو اس بات پر اصرار تھا کہ چونکہ وحی کے ذریعے حاصل ہونے والے علم میں عقل آزاد [یعنی انسانی خواہشات کے تابع] نہیں ہوتی اور اس علم کی بنیاد ''انسان سے باہر'' ہے [یعنی خدا کی طرف سے]، لہذا یہ صحیح معنوں میں علم کہلانے کا مستحق نہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ فرضی اور مضحکہ خیز دعوی بھی کر ڈالا کہ آزاد عقل [جو وحی کے تابع ہونے کے بجائے انسانی خواہشات کے تابع ہو] کے ذریعے انسان ایک ایسا نظام علم تعمیر کرسکتا ہے جو مفروضوں سے پاک اور آفاقی ہو اور جس کی بنیاد ایسی شے پر ہو جسے ہر ''انسان'' اپنے خیالات، خواہشات اور امیدوں سے ماوراء رہ کر بھی اپنے وجود کے احساس کے ساتھ جانچ سکے۔ مذہبی معیار علم سے خفگی اور کسی دوسرے منبع علم کی تلاش کے پیچھے جو اصل خواہش سرگرم عمل تھی وہ طلب آزادی، یعنی عبدیت سے بغاوت، تھی اور یہی آزادی [Autonomy] جدیدیت [modernism] کی بنیادی قدر اور مقصد ہے۔ یعنی جب انسان اپنے رب سے بغاوت کا اعلان کر کے اپنے

آزاد[یعنی انا ربکم الاعلی] ہونے کا جھوٹا فرعونی دعوی کرتا ہے تب ہی اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ حقیقت وہ نہیں جو انبیاء علیہم السلام نے بتائی، بلکہ حقیقت تو میں خود جان سکتا ہوں بلکہ حقیقت وہ ہے جسے میں خود تخلیق اور تعمیر کرسکوں۔اس کفر کے بعد جو شے انسان کو ذریعہ علم کے طور پر نظر آتی ہے وہ آزاد عقل ہوتی ہے۔آزاد عقل سے مراد ایسی عقل ہے جو وحی اور مرضی رب کے نہیں بلکہ انسانی خواہشات کے تابع ہو۔ چنانچہ کافرانہ جنون کے بعد انھوں نے ایک ایسے معیار علم کی تلاش شروع کی جو [۱]معروضی [Objective]، [۲] آفاقی [Universal]اور [۳]مفروضوں سے پاک ہو[presuppostions less]۔مناسب ہوگا کہ مختصراً یہاں ان اصطلاحات کے وہ معنی بیان کردیئے جائیں جو اہل مغرب نے بیان کیے تھے۔یادرہے کہ یہ محض دعوے ہی دعوے ہیں جن کے کوئی معنی نہیں۔

معروضیت [Objectivity] سے مراد حقیقت کی بابت کسی دعوے کا انسانی خواہشات، ارادوں، تجربات یا خیالات وغیرہ سے ماوراء[impersonal] ہونا ہے۔یعنی معروضی دعوی ایک ایسے دعوے کو کہتے ہیں جسکا تعلق کسی خاص فاعل [subject] سے نہیں بلکہ اس شے [object] سے ہو جس کے بارے میں دعوی کیا جارہا ہے۔مثلاً فرض کریں کہ کوئی کہتا ہے کہ 'جلتی ہوئی ٹیوب لائٹ سے خوف پیدا ہوتا ہے'۔اب یہ طے کرنے کے لیے کہ آیا یہ ایک معروضی دعوی ہے یا نہیں آپ یہ دیکھیں کہ کیا دنیا کے ہر شخص کو جلتی ہوئی ٹیوب لائٹ کے نظارے سے خوف محسوس ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں، تو اسکا مطلب یہ ہے کہ یہ دعوی ایک غیر معروضی یا subjective دعوی ہے کیونکہ اسکا تعلق ٹیوب لائٹ سے نہیں بلکہ کسی خاص شخص کے ذاتی احساسات کیساتھ ہے۔اس کے مقابلے میں یہ دعوی کہ 'جلتی ہوئی ٹیوب لائٹ سے روشنی نکلتی ہے' ایک معروضی حقیقت کا بیان ہے کیونکہ دنیا کا ہر صحیح الحواس شخص جب بھی جلتی ہوئی ٹیوب لائٹ دیکھے گا اسے روشنی دکھائی دے گی۔ چنانچہ اشیاء کے بارے میں ایک ایسا دعوی یا حکم جسکا وجود یا عدم وجود کسی انسان کے ساتھ نہیں بلکہ اشیاء کے ساتھ ملحق ہو تو وہ ایک معروضی دعوی [objective fact] یا حکم کہلائے گا۔انہیں معنوں میں ٹیوب لائٹ دیکھنے سے 'روشنی کا نظارہ' ایک معروضی جبکہ 'خوف کا احساس' ایک غیر معروضی حقیقت ہے کیونکہ ثانی الذکر کا تعلق ٹیوب لائٹ سے نہیں بلکہ کسی خاص شخص سے ہے۔ایسے ہی 'کشش ثقل کی وجہ سے گیند کا زمین کی طرف گرنا' ایک معروضی حقیقت ہے کیونکہ دنیا کا جو بھی شخص گیند ہوا میں پھینکے گا گیند زمین کی طرف گرے گی، اس کے مقابلے میں اگر معاملہ ایسا ہوتا کہ میرے گیند پھینکنے پر تو وہ زمین پر آگرتی مگر آپ کے پھینکنے سے نہیں گرتی تو کشش ثقل ایک غیر معروضی حقیقت کہلاتی کیونکہ اس صورت میں گیند کے گرنے کا تعلق کشش ثقل سے نہیں بلکہ میری ذات سے ہوتا۔ چنانچہ مغربی مفکرین نے معروضیت کے ذریعے حقیقت جاننے کا دعوی کیا [اس کی اسلامی تنقید آگے آرہی ہے]۔ یہاں اس دعوے کی داخلی تنقید

بیان کرنے کا موقع نہیں، ورنہ کانٹ کے Transcendental Subjectivism کے بعد تو حصول معروضیت کے سارے دعوے ہی خاک میں مل گئے ہیں [اسکا خلاصہ یہ ہے عقل محض [pure reason] کا کوئی وجود نہیں، اور نہ ہی عقل کے ذریعے اشیاء کی حقیقت [جسے کانٹ nomenon کہتا ہے] جانی جا سکتی ہے بلکہ عقل کے ذریعے انسان اشیاء کے بارے میں جو کچھ بھی جان سکتا ہے وہ اس کے اپنے نفس کی ساخت [structure] ہی کا عکس ہے اور وہ ساخت کہیں باہر نہیں بلکہ خود انسان میں موجود ہے، لہٰذا معروضیت کے سارے دعوے محض دیوانے کی بڑ ہیں]۔ اس ضمن میں سب سے مزے کی بات تو یہ ہے کہ جس عقل محض کے امکان کو مغرب میں اٹھارویں صدی میں ہی رد کیا جا چکا تھا، آج ہمارے مفکرین اسی عقل محض کے گیت گا کر خود کو عقل مند سمجھ رہے ہیں یہ عقل مند مغربی فلسفے اور سائنس کی حقیقت نہیں جانتے۔

آفاقیت [Universality] سے مراد حقیقت کی بابت کسی دعوے کا زمان و مکان کی قیود سے ماوراء ہونا ہے۔ یعنی اگر کسی دعوے کے وجود یا عدم وجود کا حکم کسی خاص زمان یا مکان کیساتھ خاص نہ ہو تو وہ ایک آفاقی دعوی کہلائے گا۔ انہیں معنوں میں 'کشش ثقل کا ہونا' عام طور پر ایک آفاقی دعوی سمجھا جاتا ہے کیونکہ دنیا کے ہر مقام اور زمانے میں اس کا مشاہدہ گیند کے گرنے کی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں پانی کے نقطہ ابال کا درجہ حرارت زمین کی سطح سمندر سے بلندی کی تبدیلی سے بدلتا رہتا ہے۔ لہٰذا 'پانی کا نقطہ ابال' ایک غیر آفاقی یا دوسرے لفظوں میں مقام میں مقید حقیقت ہے کیونکہ دنیا کے ہر مقام پر یہ حقیقت یکساں کیفیت کے ساتھ قابل مشاہدہ نہیں۔ اسی طرح 'زمین کا درجہ حرارت' بھی ایک غیر آفاقی دعوی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زمین کے درجہ حرارت میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے، یعنی 'زمین کا درجہ حرارت کتنا ہے' اسکا کوئی ایسا جواب نہیں جو ہر زمانے کے لیے درست ہو۔ یہاں بھی یاد رہے کہ عقل کی بنیاد پر آفاقیت کی تلاش محض ایک فریب ہے جو مغربی مفکرین آفاقیت کے نام پر دنیا کو دیتے رہے۔ پس جدیدی [post-modern] مفکرین نے ان تمام دعووں کی حقیقت واضح کر دی ہے۔ اسی طرح فزکس کی دنیا میں آئن سٹائن کے بعد اب کوئی مغربی مفکر معروضیت اور آفاقیت کی بات زبان پر نہیں لاتا کیونکہ مغرب میں آفاقیت کی بات کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہتا ہو کہ دنیا گائے کے سینگ پر قائم ہے۔

مفروضیت سے پاک [pre-suppositionless] ہونے سے مراد حقیقت کی بابت کسی دعوے کا ماقبل تجربے سے ماوراء ہونا ہے، یعنی اس دعوے کو قبول کرنے کے لیے پہلے سے کچھ فرض نہ کرنا پڑے۔ دوسرے لفظوں میں اگر کسی دعوے کے وجود یا عدم وجود کا حکم کسی اور دعوے کے وجود یا عدم وجود پر منحصر نہ ہو تو وہ دعوی مفروضیت سے پاک یا ماوراء کہلائے گا۔ مثلاً اس مثال پر غور کریں کہ 'دنیا کی تمام اشیاء بہت سے خطوط مستقیم سے مل کر بنتی ہیں۔ اس دعوے میں ٹھوس اشیاء کی حقیقت کے بارے میں کہی گئی

بات اس وقت تک نہیں سمجھی جا سکتی جب تک خط مستقیم کی حقیقت واضح نہ ہو جائے، لہذا یہ مفروضیت سے پاک دعوی نہیں ہے۔ اب اگر خط مستقیم کی حقیقت کوئی اس طرح بیان کرے کہ 'ایک خط مستقیم کئی نقاط کا مجموعہ ہوتا ہے'، تو یہ دعوی بھی مفروضیت سے پاک نہیں کیونکہ اس میں کیے گئے دعوے کی حقیقت اس وقت تک نہیں سمجھ آ سکتی جب تک کہ 'نقطے' کی حقیقت واضح نہ ہو جائے، یعنی اس دعوے کی صحت اور بطلان نقطے کے وجود وعدم وجود اور اس کی حقیقت پر منحصر ہے۔ اس کے مقابلے میں ریاضی دانوں کا یہ دعوی کہ 'نقطہ ایک ایسا وجود ہے جسکا مقام [Position] تو ہے مگر سمت [Dimension] نہیں' یا 'نقطہ ایک ایسا دائرہ ہے جسکا قطر صفر ہے' ایک ایسا دعوی ہے جس کے ثبوت کے لیے کوئی مزید دلیل نہیں دی جا سکتی کیونکہ سمت کا تصور بذات خود نقطے ہی کے وجود کا مرہون منت ہے۔ ایسے ہی دائرے کا تصور بھی نقطے کا محتاج ہے۔ عملاً نہ تو نقطہ بنایا جا سکتا ہے کیونکہ جیسے ہی آپ قلم کی مدد سے اسے بنائیں گے تو اس کی کوئی سمت لازماً ظاہر ہوگی اور نہ ہی اس بات کو عقلاً سمجھا جا سکتا ہے کہ غیر سمتی شے کیسی ہوگی، مگر اس کا وجود ماننا بھی ضروری ہے کیونکہ اسکا وجود مانے بغیر کسی بھی ٹھوس شے کا وجود ہرگز ثابت نہیں کیا جا سکتا، انہیں معنوں میں اسے مفروضیت سے پاک دعوی سمجھا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ مفروضیت سے پاک ہونے سے مراد کسی دعوے کا کسی خارجی دلیل کا محتاج نہ ہونا ہے، یعنی جو اپنے وجود کا جواز از خود [self-contained یا self-proved] ہوں۔ دوسرے لفظوں میں جو سب چیزوں کے لیے تو وجہ جواز ہو، مگر خود اسے ثابت کرنے کے لیے اس کے علاوہ کسی مزید خارجی حقیقت کو نہ ماننا پڑے۔ یاد رہے کہ یہ دعوی بھی کہ عقل کے ذریعے کوئی ایسی بات جانی جا سکتی ہے جو مفروضیت سے پاک ہو ایک لایعنی دعوی ہے کیونکہ ہر علم کی بنیاد ایک مابعد الطبعیاتی 'ایمان' پر ہی قائم ہوتی ہے [جیسا کہ نقطے والی مثال سے بھی واضح ہے]۔ ان اصطلاحات کی وضاحت کے بعد اب ہم نفس مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔

مفکرین مغرب کے دعووں کی نوعیت: مذہب علم کیوں نہیں؟

چنانچہ ان مغربی مفکرین کے خیال میں حقیقت کے ادراک کا معتبر ذریعہ علم وہی ہو سکتا ہے جو ان تینوں فرضی شرائط پر پورا اترتا ہو۔ ان کے خیال میں چونکہ مذہبی علم صفت معروضیت اور مفروضیت سے پاک ہونے کی شرائط پر پورا نہیں اترتا لہذا یہ حقیقت کے ادراک کا معتبر ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی بنیادی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ مذہبی علم کی بنیاد وحی پر قائم ہے اور وحی چونکہ ایک ایسی خارجی حقیقت ہے جسکا تجربہ اور مشاہدہ کسی انسان کے لیے ممکن ہی نہیں کیونکہ یہ صرف ایک نبی پر نازل ہوتی ہے، لہذا وحی سے حاصل ہونے والا علم معروضی نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ وحی پر ایمان لانے کے سوا کوئی دوسرا چارہ کار نہیں ہوتا۔ اور چونکہ وحی کے ذریعے حاصل ہونے والا حقیقت کا ادراک خود وحی پر ایمان لائے بغیر سمجھا ہی نہیں جا سکتا، لہذا یہ مفروضیت

سے پاک بھی نہیں۔ مثلاً، 'ایک نبی کا یہ دعوی کہ مرنے کے بعد زندگی کا وجود ہے اور مجھے اس کی خبر بذریعہ وحی ہوئی ہے' اس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک اس بات پر ایمان نہ لایا جائے کہ وحی بھی کوئی شے ہے۔

علم اور حقیقت کے ادراک کا معتبر ذریعہ کیا ہے؟ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا کہ اس بات کا انکار کردینا جتنا آسان تھا کہ علم وہ نہیں جو کتاب الٰہی [قرآن یا بائبل وغیرہ] میں ہے، مگر اس کے بعد پیدا ہونے والے علمی مسائل کا حل اتنا آسان نہیں تھا۔ چنانچہ اس انکار کے ساتھ کہ وحی علم کا معتبر ذریعہ نہیں ہے دو علمی سوالات کا جواب دینا ضروری لازم آتا ہے [الف] علم کہاں سے آئے گا؟ یعنی اگر علم کتاب الٰہی سے نہیں ملے گا تو پھر انسان کے پاس حقیقت کے ادراک کے لیے حصول علم کا اور ایسا کونسا ذریعہ ہے جو ان تینوں شرائط پر پورا اترتا ہو، [ب] اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس ذریعہ علم سے حاصل ہونے والا علم صحیح ہے؟ یعنی حقیقت کا جو بھی ادراک اس ذریعہ علم سے ہورہا ہے اس کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار کیا ہوگا۔ المختصر، دونوں سوالوں کا خلاصہ یہ کہ حقیقت کے ادراک کا معتبر ذریعہ علم کیا ہوگا۔ یہ ہیں وہ دو اہم سوالات جو علمیات کے میدان میں زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ سائنس یا سائنسی طریقہ علم درحقیقت انہی دو سوالات کے جوابات کے طور پر پیش کیے گئے تھے یعنی وحی سے بھی برتر ذریعہ حصول علم اگر کوئی ہے تو وہ جدید سائنس کا طریقہ ہے۔ جدید سائنس [Modren Science] درحقیقت وحی سے علی الرغم اور بغاوت خداوندی پر مبنی علمیت کا نام ہے۔ پچھلے مضمون میں ہم نے ان دلائل اور ان کی کمزوریوں کا تفصیلی خاکہ پیش کیا تھا جو مغربی مفکرین نے اپنے اس دعوے کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے اب تک وضع کیے ہیں۔ اس تحریر کا نفس مضمون اجازت نہیں دیتا ورنہ ہم مغربی مفکرین کے ان دعووں کی علمی کمزوریاں خود انکی زبانی کئی اور جہات سے واضح کرتے جس کی روشنی میں یہ بات تقریباً پایہ تکمیل کو پہنچ چکی ہے کہ انسانی عقل پر مبنی کسی ایسے علم کی تشکیل ممکن ہی نہیں جو مندرجہ بالا تین شرائط پر پورا اتر سکے۔ ایمانیات کے بغیر عقل محض پر مبنی معروضی علم کی تشکیل ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ یہاں تو ہمیں سائنس کی اسلام کاری کے ضمن میں اسلامی علمیت سے وضع کردہ ان دلائل کا جائزہ لینا ہے جو ایک عرصے سے ایک بڑے حلقہ احباب و دانشوران کی طرف سے پیش کیے جارہے ہے۔ لہذا اس مضمون میں ہم کوشش کریں گے کہ اپنے پچھلے مضمون کی روشنی میں اس قسم کی کوششوں کے مضمرات کو کھول کر واضح کردیں۔

مضمون کی ترتیب: چار حصے: اس مضمون کے مباحث کو ہم چار حصوں میں تقسیم کریں گے: سب سے پہلے ہم ان گمراہیوں کی طرف اشارہ کریں گے جو اسلام کو سائنسی تصور علم قائم کرنے سے پیدا ہوتی ہیں، پھر ان دلائل کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے گا جو سائنس کو اسلامیانے کے ضمن میں وضع کیے گئے ہیں، تیسرے نمبر پر ہم نوع انسانی کے فکری ارتقاء کے نظریہ اور اس کے مضمرات پر روشنی ڈالیں گے، اور آخر میں قرآن کی

سائنسی تفسیر کے اسلوب کے ضمن میں پائی جانے والی گمراہیوں کا تذکرہ کریں گے۔ گمراہیوں کا نمبر شمار مضمون کے ہر حصے میں علیحدہ علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔

اسلام ایک سائنسی مذہب ہے! مناسب ہوگا کہ ہم جملے 'اسلام ایک سائنسی مذہب ہے' کا وہ تصور بیان کردیں جو عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں پایا جاتا ہے تاکہ باقی تفاصیل پڑھتے وقت مضمون کا اصل عمود ملحوظ خاطر رہے۔ یہ جملہ کہ 'اسلام ایک سائنسی مذہب ہے' آج کل ایک فیشن سا بن گیا ہے۔ عام طور پر اس جملے سے مراد یہ سمجھی جاتی ہے کہ:

☆ سائنس اور اسلام ایک ہی حقیقت کے ادراک کے دو مختلف طریقے ہیں، یعنی دونوں بنیادی طور پر ایک ہی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہیں نیز دونوں ذرائع سے حاصل ہونے والے حقیقت کے ادراک اور نتائج میں کسی قسم کا تضاد نہیں پایا جاتا

☆ جس طرح سائنس آزاد عقل کے عین مطابق ہے اسی طرح اسلام بھی آزاد عقل کے تقاضوں کے عین مطابق ہے یا در ہے کہ اسلام آزاد عقل [وہ عقل جو خواہشات کے تابع ہو] نہیں بلکہ عقل سلیم [وہ عقل جو وحی کے تابع ہو] کے مطابق ہے۔ ☆ جس طرح سائنس تجربے اور مشاہدے کے اصول کے تحت معروضی علم کی تشکیل کرتی ہے ایسے ہی اسلامی تعلیمات کو بھی معروضی انداز میں تجربے اور مشاہدے کی کسوٹی پر پرکھا جاسکتا ہے۔ ☆ جس طرح سائنس تجربے اور مشاہدے کو حتمی ذریعہ علم گردانتی ہے ایسے ہی قرآن بھی تجربے اور مشاہدے پر پوری طرح زور دیتا ہے

آیئے اب اس سادہ سے جملے میں جو قیامت پنہاں ہے اسکا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا جائے۔

گمراہی ۱.۱ : اسلام اور سائنس ایک ہی حقیقت کی تلاش میں ہیں

یہ ایک ایسی غلط فہمی ہے جو عوام و خواص دونوں کو لاحق ہے کہ سائنس اور مذہب ایک ہی حقیقت کی تلاش میں ہیں بس دونوں کے راستے جدا جدا ہیں [غالباً علامہ اقبالؒ وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے فلسفیانہ سطح پر اپنے خطبات میں اس نقطہ نظر کا ذکر کیا ہے، واللہ اعلم بالصواب]۔ اس غلط فہمی کی وجہ سائنس کے تصور حقیقت [conception of reality] کا غیر علمی ادراک ہے۔ یعنی لوگوں نے سائنس اور اسلام کے تصور حقیقت کا بنیادی فرق سمجھے بغیر ہی یہ تسلیم کرلیا کہ حقیقت وہی ہے جسے سائنس معروضیت [objectivity] کہتی ہے۔ لہذا اس گمراہی کے ازالے کے لیے ضروری ہے کہ ہم حقیقت اور معروضیت کا بنیادی فرق اچھی طرح سمجھ لیں تاکہ قلب و ذہن سائنس کے باطل تصور حقیقت سے پاک و صاف ہو جائیں۔ اسی فرق سے اس بات کی قلعی بھی کھل جائے گی کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ادراک حقیقت کے ذریعہء علم [source of perceiving reality] پر سائنس معروضیت کی شرط کیوں لگاتی ہے۔

حقیقت اور معروضیت کا فرق:

سائنس کے نزدیک حقیقت کی ماہیت معروضیت میں چھپی ہے، دوسرے لفظوں میں حقیقت [reality] انسان سے باہر علیحدہ سے کہیں موجود ہے [کیونکہ معروضی وہی شے کہلاتی ہے جو انسان سے باہر ہو] اور انسان اسکا ادراک اپنی ذات [self] سے ماوراء ہو کر کرسکتا ہے۔ اس بات کو عام الفاظ میں یوں سمجھئے گویا سائنس کے نزدیک حقیقت ایک ایسا وجود ہے جیسے کہ گیند یا سیب وغیرہ، یعنی جیسے انسان ایک گیند کو اپنے وجود سے باہر ایک علیحدہ وجود کے طور پر محسوس کرسکتا ہے بالکل ایسے ہی سائنس کے نزدیک حقیقت ایک ایسی شے ہے کہ جسے انسان اپنے وجود سے باہر اور اس حقیقت سے علیحدہ رہ کر بھی محسوس کرسکتا ہے۔ معروضیت [objectivity] ہی سائنس کا تصور حقیقت [conception of reality] ہے اور ہر وہ شے جو معروضی نہ ہو سائنس کے نزدیک حقیقت نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ سائنس کا یہی وہ تصور حقیقت ہے جس کی وجہ سے سائنس دان اس بات پر مصر ہیں کہ حقیقت [یعنی معروضیت] کو جاننے کا معتبر ذریعہ بھی وہی ہوسکتا ہے جو معروضیت تک رسائی ممکن بناتا ہو اور ہر وہ ذریعہ علم جس کے ذریعے معروضیت تک پہنچنا ممکن نہ ہو تو اس ذریعے سے آنے والی معلومات علم نہیں۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ سائنس کا یہ تصور کہ معروضیت حقیقت ہے بذات خود ایک ایسا دعوی ہے جس کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ اس تصور حقیقت کی اپنی حقیقت محض ایک ایمان کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا کہ اولاً تو انسانی ذرائع علم سے معروضیت کا حصول ممکن ہے ہی نہیں، دوسرا اس لیے کہ سائنس نے یہ دعوی کہ معروضیت حقیقت ہے اس بنیاد پر نہیں کیا تھا کہ اس نے معروضیت کو پا لیا تھا، بلکہ یہ محض ایک افسانوی تصور تھا جس کے وجود کی نہ تو آج تک کوئی دلیل دی جاسکی ہے اور نہ ہی اسکا کوئی مسمــــہ بــہ موجود ہے کہ جسے معروضی کہا جاسکے۔ دوسری بات یہ کہ مذہب [بالخصوص اسلام] کے نزدیک حقیقت ہرگز بھی وہ نہیں جسے سائنس معروضیت کہتی ہے، بلکہ اسلام میں حقیقت تو بس ذات باری تعالی ہی ہے اور جس کے ادراک کا ذریعہ وہ خاص علم ہے جو اللہ تعالی اپنے خاص بندوں پر نازل فرماتا ہے، یعنی وحی۔ اور ایک بندہ جب وحی میں بتائے گئے احکام شریعت پر کاربند ہوتا ہے، نیز اپنے قلب کو رذائل نفسانیہ اور گناہوں کی غلاظت سے بچاتے ہوئے اسے اخلاق حمیدہ سے متصف کرتا ہے تو اس کے قلب میں وہ نورانیت پیدا ہوجاتی ہے جس سے حقیقت کا ادراک حاصل ہوتا ہے اور اسی ادراک حقیقت کو خاصان خدا معرفت الٰہی کہتے ہیں۔ چنانچہ یہی معرفت الٰہی اصل حقیقت ہے جسکا ادراک دائمی پابندیٔ شریعت اور قلب کی دنیا میں ڈوبے بغیر ہرگز ممکن نہیں۔ وہ علم جس سے یہ معرفت الٰہی حاصل ہوتی ہے اس کے بارے میں حجۃ الاسلام امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

''اس علم کا نام علم باطن ہے اور یہ علم ہی دوسرے تمام علوم کی غرض وغایت ومنتہا ہے۔ یہ ایک

نور کا نام ہے۔۔۔ جب دل برائیوں سے پاک وصاف ہوجاتا ہے تو یہ نور ظاہر ہوتا ہے اور اس نور سے آدمی پر ایسی بہت سی باتیں منکشف ہوتی ہیں جن کا وہ پہلے محض نام سنا کرتا تھا یا انکے کچھ مجمل اور غیر واضح معنی وضع کرلیا کرتا تھا' [احیاء العلوم، جلد اول، کتاب العلم: ص ۶۱]

کیا معروضیت حقیقت ہے؟ تجربیت [empericism] کا رد:

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اصل حقیقتِ انسانی 'عبدیت' ہی ہے، یعنی انسان کی حقیقت اس کے سواء اور کچھ بھی نہیں کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور اس کی یہ حقیقت اس سے کہیں باہر [objective] نہیں بلکہ اس کے اندر ہے۔ دوسرے لفظوں میں معاملہ یہ نہیں کہ انسان اپنی عبدیت کو اپنے وجود سے علیحدہ ہوکر بھی سمجھ سکتا ہے [جیسا کہ سائنس کے تصور معروضیت کا تقاضہ ہے]، بلکہ یہ عبدیت ہی اسکا اصل جوہر [essence] ہے اور اسکا ادراک رسوم بندگی ادا کیے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ لہذا سائنس کا یہ دعوی کہ معروضیت حقیقت ہے ایک باطل اور مردود دعوی ہے۔ سائنس کے دعوائے معروضیت [یعنی حقیقت انسان سے کہیں باہر ہے] کا مطلب یہ ہوا کہ حقیقت انسانی عبد ہونا نہیں کیونکہ عبدیت تو اس کے اندر ہے لہذا یہ حقیقت نہیں۔ لیکن پھر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ یعنی اگر انسان کی حقیقت عبدیت نہیں ہے، تو پھر سائنس کے نزدیک تصور انسان [conception of man] کیا ہے؟ یہی وہ سوال ہے جو موجودہ سائنس کی اصل حقیقت، ماہیت اور مقصد کو کھولنے اور سمجھنے میں مدد دے گا، مگر اس سے قبل ایک اور ضروری بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے، اس کے بعد پھر ہم اس سوال پر کچھ کلام کریں گے۔

تصور حقیقت اور علمیت کا باہمی تعلق: یہاں یہ بات بھی نوٹ کرلینی چاہئے کہ تصور علمیت [epistimology] کا حقیقت کے مابعد الطبعیاتی تصور [metaphysics] سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یعنی علم کیا ہے، علمی ترقی کیا ہے، نیز علم حاصل کرنے کا ذریعہ کیا ہے ان تمام سوالات کا جواب اس بات پر منحصر ہے کہ کسی شخص کے نزدیک حقیقت کا تصور کیا ہے۔ مذہب سائنس اور فلسفہ حقیقت کے جاننے کا دعوی کرتے ہیں تو یہ دعوی کچھ اعتقادات، ایمانیات کے بغیر ممکن نہیں لہذا سائنس فلسفہ اور مذہب کی بنیاد اعتقادات، الٰہیات، ایمانیات اور مفروضات پر رکھی جاتی ہے۔ چونکہ سائنس کے نزدیک حقیقت معروضیت ہے، لہذا اس کے تصور علم میں: ☆ علم وہی ہے جس میں معروضی حقائق [جسے سائنس 'علت ومعلول'، Cause and effect، کہتی ہے] کا بیان ہو۔ ☆ علمی ترقی سے مراد اسی نوعیت کے زیادہ سے زیادہ بیانات دریافت کرنا ہے جو معروضی ہوں [چاہے ایسے بیانات جانوروں کے بارے میں ہی کیوں نہ ہوں] ☆ ذریعہ علم وہی ہے جو معروضیت تک لے جانے والا ہو۔ اس کے مقابلے میں اسلام کے تصور حقیقت سے جو تصور علم نکلتا ہے اس کے مطابق: ☆ علم وہی ہے جس میں احکام شریعہ [یعنی وہ بیانات جو یہ

بتائیں کہ رضائے الٰہی کس شے میں ہے] کا بیان ہو۔☆ علمی ترقی سے مراد احکام شریعہ کی زیادہ سے زیادہ تخریج اور اسپر عمل کرنا ہے۔☆ ذریعہ علم وحی [اور اس میں بتایا گیا علم باطن] ہے

چونکہ سائنس اور اسلام کے تصورات حقیقت ہی جدا جدا ہے لہٰذا دونوں کے تصور علم میں بھی فرق ہے۔اس فرق کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے رؤیائے صادقہ [انبیاء اور صالحین کے خواب] بھی ادراک حقیقت [معرفت الٰہی] کے ضمن میں علم کا ذریعہ ہیں [اس فرق کے ساتھ کہ انبیاء کو خواب میں جس حقیقت کا ادراک ہوتا ہے وہ قطعی اور واجب الایمان و اطاعت ہوتا ہے جبکہ اور لوگوں کے خواب کے لیے یہ صفات ثابت نہیں] جبکہ سائنس قطعاً اسے ذریعہ علم نہیں مانتی۔

ادراک حقیقت کا ذریعہ صرف وحی اور نبی ہیں: یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ وحی اور انبیاء کی تعلیمات کے علاوہ اور کوئی ایسا ذریعہ علم نہیں جس کے ذریعے انسان حقیقت کا ادراک کر سکے۔ حقیقت کی معرفت ایمان اور دائمی شریعت پر عمل کیے بغیر کسی اور ذریعے سے ممکن ہی نہیں۔اور اس ادراک کا پرتو 'قلب مومن' پر پڑتا ہے نہ کہ 'عقل انسانی' پر۔چونکہ سائنس کا تصور حقیقت [معروضیت] ہی مذہب کے تصور حقیقت [معرفت الٰہی] سے مختلف ہے، لہٰذا وہ وحی کو ادراک حقیقت کا ذریعہ علم نہیں مانتی۔اور تو اور پورے مغربی فلسفیانہ فکر میں جہاں حواس خمسہ، زبان، عقل اور وجدان پر بحیثیت منبع علم کے طویل بحثیں ملتی ہیں وہاں قلب کو بطور ذریعہ علم کے کہیں ذکر ہی نہیں کیا گیا۔اس ضمن میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ جدید مسلم مفکرین تو اب قرآنی اصطلاح 'قلب' کا ترجمہ ہی 'عقل'[reason] کرنے لگے ہیں جس کی بنیادی وجہ اس سائنسی دعوے سے مرعوبیت ہے کہ سوچنے کا کام دماغ کرتا ہے نہ کہ دل [اس پر مزید بحث مضمون کے آخری حصے میں دیکھئے]۔چونکہ سائنس حقیقت کا یکسر مختلف تصور رکھتی ہے، لہٰذا اس کے ادراک کے لیے اسکا مفروضہ ذریعہ علم بھی مختلف ہے۔اس ضمن میں مزے کی بات یہ ہے کہ سائنس آج تک اپنی مفروضہ حقیقت [معروضیت] تک بھی نہیں پہنچ سکی۔اور یہی نہیں بلکہ پس جدیدیت [Post-modernism] نے تو اس بات کو پایائے تکمیل کو پہنچا دیا ہے کہ معروضیت کی تلاش کا یہ سفر کبھی بھی اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔اور پہنچے بھی کیسے، کیونکہ جس شے [معروضیت] کو سائنس حقیقت سمجھ کر تلاش کر رہی ہے وہ حقیقت ہے ہی نہیں، بلکہ وہ تو سراب ہے۔چونکہ سائنس کا تصور حقیقت ہی باطل اور مردود ہے، لہٰذا سائنس نہ تو کبھی حقیقت تک پہنچ سکتی ہے اور نہ ہی وہ انسان کو کوئی ایسا ذریعہ علم بتا سکتی ہے جو اسے اصل حقیقت [معرفت الٰہی] تک لے جا سکے۔ [اسی لیے پس جدید مفکرین کے یہاں مابعد الطبیعیاتی سوالات لایعنی ٹھہرے اور موت پر تفکر و تدبر ختم ہو گیا اور ان سوالات کا جواب دینے میں ناکامی کے بعد اپنی اصلاح کے بجائے فلاسفہ نے زندگی، موت، کائنات، خدا، آخرت کے سوالات کو بے کار قرار دیا۔] اصل بات یہ ہے کہ سائنس کا تصور حقیقت بس

مخلوقات تک ہی محدود ہے اور اس سے نکلنے والا تصور علم انسان کو مخلوق میں اور دنیا اس طرح الجھا دیتا ہے کہ اسے اپنے خالق سے لو لگانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ پس یہ بنیادی بات بہت اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ سائنس اور اسلام ہرگز ایک حقیقت کی تلاش میں نہیں ہیں اور یہی غلط فہمی سب غلط فہمیوں کی جڑ ہے۔

سائنس کا اصل خدا کون؟ یہ غلط فہمی کہ سائنس اسی حقیقت کی تلاش میں ہے جو مذہب بتاتا ہے اس وجہ سے بھی دلوں میں گھر کر گئی ہے کیونکہ مسلم مفکرین کے خیال میں جدید سائنسی تحقیقات اب کسی ایسے وجود کی طرف اشارہ دے رہی ہیں جو اس منضبط کائنات کو چلانے کے لیے لازم ہے۔ اثبات خدا کے ضمن میں یہ ہرگز کوئی نئی دلیل نہیں بلکہ وہی پرانی دلیل ہے جسے متکلمین اور فلاسفہ 'دلیل ربط' [Design argument] کہتے ہیں۔ چنانچہ اہل علم پر اس دلیل کی کمزوریاں واضح ہیں [اس کی تفصیل بیان کرنا مضمون کا مقصد نہیں]۔ لیکن فرض کریں کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ سائنس کسی طرح ایک ایسے وجود کی طرف اشارہ کرتی ہے جسے خدا کہا جا سکتا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے سائنسی خدا کا کردار اس دنیا میں سوائے اس کے اور کیا رہ جاتا ہے جسے سائنس اور فلسفے کی زبان میں clock maker god کہتے ہیں۔ یعنی خدا اگر ہے بھی تو اس کی حیثیت بس ایک گھڑی میں چابی بھرنے والے شخص کی سی ہے جو گھڑی میں جب ایک دفعہ چابی بھر دے تو گھڑی اس چابی بھرنے والے کے بغیر خود بخود چلتی رہتی ہے، اسی طرح خدا نے علل و معلول کے اصولوں کے تحت ایک مرتبہ یہ دنیا بنا کر چھوڑ دی ہے اور اب اس کی حقیقت اور معنویت سمجھنے کے لیے اس خدا کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔ گویا علت و معلول کا قانون ہی اشیاء کی اصل حقیقت ہے نیز یہ کہ حوادثات عالم کی تشریح اور حقیقت کے لیے کسی ایسی مقصدیت کو تلاش کرنا جس کی نسبت ارادہ انسانی سے باہر مثلاً خدا کی طرف ہو سائنس کے نزدیک ایک لایعنی اور مہمل بات ہے۔ مثلاً اگر کوئی مومن یہ سنتا ہے کہ جب زنا کی کثرت ہوتی ہے تو زلزلے کثرت سے آتے ہیں [جیسے کہ حدیث میں آیا ہے] تو حوادث عالم [زلزلہ آنے] کی حقیقت کا یہ ادراک اس میں برے اعمال سے توبہ اور اصلاح احوال کی فکر کرنے کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ مگر سائنس کے نزدیک یہ بات ہی مہمل اور بے معنی ہے کیونکہ یہ اس کے تصور حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتی۔ چنانچہ ایک ایسا شخص کہ جس کی عقل و خرد پر سائنس کے تصور حقیقت کی گرد پڑ گئی ہو اس واقعے کو معروضیت [objectivity] کی نظر سے دیکھ کر یہ کہے گا کہ زلزلہ زمین کے اندر چند جغرافیائی نوعیت کی تبدیلیوں کی وجہ سے آتا ہے۔ اس نقطہ نظر کی کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے یہ صرف سائنس کا ایمان عقیدہ اور مفروضہ ہے۔ کہ زمین میں ہلچل رکابیوں کے ہلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ رکابیاں کیوں ہلتی ہیں کون ہلاتا ہے۔ رکابیاں [Plates] کس نے بنائیں، سائنس یہاں چپ ہو جاتی ہے یا مفروضات اور اپنی دیومالا پر بھروسہ کرتی ہے۔ سائنس کے نزدیک اس دنیا میں رونما ہونے والا ہر واقعہ علت و معلول کے اسی قانون کے

ماتحت ہوتا ہے اور اگر انسان یہ سلسلہ دریافت کرلے تو وہ نہ صرف یہ کہ اس کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے بلکہ اسے قابو میں لاکر اس پر اپنا تسلط قائم کرسکتا ہے اور سائنس کے نزدیک انسان کا کائناتی تسلط ہی اصل حقیقت اور مقصد انسانی ہے۔ دوسرے لفظوں میں سائنس کا اصل خدا انسان ہی ہے کیونکہ سائنس کا تصور حقیقت [conception of reality] انسان کو قائم بالذات تصور کرتا ہے، اور یہی سائنس کا تصور انسان [conception of man] ہے جسکا ذکر اوپر کیا گیا تھا۔

سائنس: عقل ہی واحد ماخذ علم ہے: اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سائنس کا تصور حقیقت اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ حقیقت [معروضیت] کا ادراک انسانی ذرائع علم [خاص طور پر عقل] کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ سائنس کے نزدیک عقل انسانی ہر حقیقت سے ماوراء اور بلندتر ایک ایسا وجود ہے جو ہر شے کی حقیقت جاننے کے لیے بمثل میزان ہے کہ ہر شے کی حقیقت تو اس پر منحصر ہے مگر یہ کسی اور شے کے تابع نہیں۔ گویا عقل انسانی قائم بالذات ہے اور یہی انسان کا جوہر [essence] ہے [چنانچہ ڈیکارٹ [Descartes] کے ہاں تو یہ تصور سب سے واضح طور پر I think, therefore I am، یعنی 'میں سوچتا ہوں اسی لیے میں ہوں' کے الفاظ میں ملتا ہے]۔ جب یہ معلوم ہوگیا کہ سائنس کا تصور انسان ایک ایسا قائم بالذات، آزاد اور خود مختار وجود ہے جسکا مقصد اپنے ارادہ [خواہش] کی تکمیل ہے تو اب اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے انسان کا کائنات کے ساتھ تعلق کس نوعیت کا ہوگا؟ دوسرے لفظوں میں سائنسی طریقہ علم سے انسان کائنات میں جس حقیقت [معروضیت جو علل و معلول کی شکل میں اپنا اظہار کرتی ہے] کا ادراک کرے گا اس کی معنویت کیا ہوگی نیز یہ معنی انسان کہاں سے حاصل کرے گا؟ چونکہ انسان آزاد اور قائم بالذات ہے، لہذا اسکا ارادہ ہی معنویت کا واحد منبع ہے اور اسی ارادہ انسانی کے نقطہ نگاہ ہی سے ہر حقیقت کو معنی دئے جائیں گے۔ اس ارادہ انسانی کے نقطہ نگاہ سے علت و معلول کی صورت میں ظاہر ہونے والے ہر قانون کا مطلب ہے 'انسانی ارادے کی تکمیل کی نئی حد' [limit to freedom]۔ مثلاً فرض کریں کوئی یہ چاہتا ہے کہ وہ کسی اونچے مقام سے چھلانگ لگائے مگر زمین پر نہ گرے تو کشش ثقل کے قانون نے اسے بتادیا کہ ایسا کرنا ممکن نہیں۔ لہذا اب اگر انسان اپنے ارادے [ہوا میں اڑنا وغیرہ] کی تکمیل چاہتا ہے تو کوئی ایسا طریقہ اختیار کرے جس کے ذریعے اس طبعی قانون کو غیر مؤثر کردے۔ گویا ہر نیا سائنسی قانون ایک طرف تو انسان کو یہ بتا رہا ہے کہ وہ کیا نہیں کرسکتا، دوسری طرف کائنات پر اپنے ارادے کے تسلط کی خواہش انسان کو اس حد [limit] کو پیچھے دھکیلنے کے لیے اسی ٹیکنالوجی [تدبیر] کو بطور آلہ استعمال کرنے پر ابھارتی ہے۔ یعنی اب وہ کچھ ایسا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کشش ثقل کے قانون کے باوجود ہوا میں اڑنے کا سامان مہیا کرسکے [مثلاً جہاز کے ذریعے] تاکہ اپنے ارادے یا خواہش کی تکمیل کرسکے۔ بالکل اسی طرح ایک سائنسی ذہنیت کا

حامل شخص زلزلے کے حادثے کو کسی خدائی تنبیہہ یا سزا وغیرہ کے معنوں میں نہیں بلکہ ان معنوں میں دیکھتا ہے کہ یہ حادثہ اس کے ارادے اور خواہشات سے علی الرغم اس کی زندگی اور اس کے سارے سکھ چین چھین لیتا ہے، گویا یہ حادثہ اسے اس کے ارادے یا آزادی کی ایک نئی حد متعین کر رہا ہے۔ لہذا اب وہ اس فکر میں لگ جاتا ہے کہ جتنا جلد ہو سکے اس حادثے کا سبب تلاش کر کے اسے اپنے قابو میں لے آئے تاکہ اس کے ان اثرات سے بچا جا سکے جو اس کی خواہش کے خلاف رونما ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ زیادہ سے زیادہ انسانی خواہشات کی تکمیل کا سامان فراہم کرنے کے لیے ارادہء انسانی کو کائنات پر مسلط کرنے کی ذہنیت [subordination of nature to human will for the maximum satisfaction of human wants] ہی موجودہ سائنس کی اصل حقیقت و ماہیت ہے۔ سائنس ہر شے کی معنویت کو انسانی نقطہ نگاہ [anthoprocentric approach] سے دیکھتی ہے جبکہ مذہب اسے خدا کی نظر [God procentric approach] سے دیکھنے کا نام ہے۔ موجودہ یعنی جدید سائنس کو اس کی مابعد الطبعیات اور اس کے تصور علم سے ہٹا کر یہ سمجھنا کہ یہ ایک غیر اقداری اور فطری قسم کا علم ہے اور جسکا مقصد نوع انسانیت کی بھلائی ہے ایک نہایت غیر علمی اور خطرناک طرز تحقیق ہے۔ خطرناک اس لیے کیونکہ آج تک جن معاشروں میں بھی علوم عقلیہ کو علوم نقلیہ پر علمی برتری حاصل ہوئی یا دونوں علوم کو مساوی تصور کیا گیا۔ وہاں مذہبی حقائق اور مذہبی معنویتِ زندگی بے معنی ہو کر رہ گئی جس کی وجہ یہ ہے کہ ہر علم کی اٹھان حقیقت کے جن مابعد الطبیعیاتی تصورات پر ہوتی ہے وہ تصورات اس علم کے ساتھ ہی افراد اور معاشروں میں منتقل ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح سائنسی علم کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کی ذہنیت بھی افراد میں پروان چڑھتی ہے جسکا آخری اور لازمی نتیجہ وہی ہوتا ہے جو مغربی معاشروں میں ہمیں نظر آ رہا ہے۔ علیت سے شخصیت ظہور پذیر ہوتی ہے، تصور علم کے سانچے بدلنے سے شخصیت بھی بدل جاتی ہے۔ مثلاً اسلامی معاشروں میں کسی عریاں شخص کو دیکھ کر لوگ حیرت و افسوس کا اظہار کریں گے۔ مغرب میں لوگ اس حیرت و افسوس پر حیرت کریں گے اور کہیں گے یہ لوگ Tolerent نہیں ہے کیونکہ مغرب میں عریانی کوئی مسئلہ نہیں ہے ان کی علیت میں یہ حلال جائز اور ٹھیک رویہ ہے۔ مغربی معاشروں میں پائی جانے والی ذہنیت کی تاریخ اور اسکا تجزیہ جناب عسکری صاحب کے مضمون میں بہت عمدہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے [دیکھئے ساحل نومبر ۲۰۰۵ کا شمارہ]۔ عسکری صاحب کے مطابق:

'نشاۃ ثانیہ کا اصلی مطلب ہے وحی پر مبنی اور نقلی علوم کو بے اعتبار سمجھنا، اور عقلیت اور انسان پرستی اختیار کرنا۔ اسی لیے اس تحریک کا دوسرا نام 'انسان پرستی [Humanism] بھی ہے۔

۱۔ انسان پرستی---یعنی ہر بات پر انسان کے نقطہ نظر سے غور کرنا۔ ۲۔ آخرت کا انکار بھی نہ کرنا مگر

F:\Shah\November 2006\SCIENCE_AND_ISLAM_for_Sahil

ایک بہت بڑا فرق رونما ہو جانا۔ازمنہ وسطی [Medieval] کے لوگ کہتے تھے کہ اصل حقیقت تو آخرت ہی ہے، یہ دنیا محض فریب ہے۔اب لوگ کہنے لگے کہ آخرت بھی حقیقی ہے اور دنیا بھی حقیقی ہے۔۳۔ آخرت چونکہ نظر نہیں آتی، اسلیے کہا گیا کہ آخرت کی فکر میں گھلنا بیکار ہے، مرنے کے بعد دیکھا جائے گا۔دنیا نظروں کے سامنے ہے، پہلے اسکا بندوبست کرو۔اس رجحان کی بہترین مثال انگریز فلسفی بیکن ہے جسے 'سب سے پہلا جدید مفکر' [اور سائنس دان] کہا جاتا ہے۔۴۔ یہ خیال بھی اس زمانے میں بہت مقبول ہوا کہ خدا کی دو کتابیں ہیں، ایک تو انجیل اور دوسری فطرت [اسی فکر کے ماتحت ہمارے ہاں 'دو قرآن' جیسی کتب سامنے آئیں]۔چنانچہ انجیل کے مطالعے کی طرح فطرت کا مطالعہ بھی دینی فریضہ ہے۔کچھ لوگ تو اس سے بھی آگے گئے اور کہنے لگے کہ انجیل کو فطرت کے مطالعے کی روشنی میں سمجھنا چاہئے۔یہ نقطہ نظر گیلیلیو کا بھی تھا [اسی کفر کو عام کرنے کے سبب کلیسا نے اسے سزا دی تھی]۔۵۔ فطرت کے حسن کی طرف بھی خاص طور پر توجہ کی گئی۔انسان کا فریضہ قرار پایا کہ فطرت کے حسن اور دنیا کی رنگینیوں سے پوری طرح لطف اندوز ہو۔سینکڑوں شاعر اس موضوع پر نظمیں لکھنے لگے کہ زندگی چندروزہ ہے، اس سے جتنا لطف اٹھایا جا سکے اٹھالو۔یعنی نفس پرستی کو اصول زندگی بنایا گیا۔۶۔ فطرت کا مطالعہ برائے مطالعہ نہیں ہونا چاہئے، بلکہ تسخیر فطرت کے لیے ہوتا کہ انسان فطرت کی قوتوں کو اپنے کام میں لا سکے۔۷۔مطالعہ فطرت کا طریقہ بھی بیکن نے مقرر کر دیا۔جس چیز کو سائنس کا طریقہ کہتے ہیں اسی سے شروع ہوا ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ چیزوں کی حقیقت صرف مشاہدے اور تجربے سے معلوم کی ہو سکتی ہے۔اس سے براہ راست منطقی نتیجہ یہ نکلا کا جو چیز مشاہدہ نہ کی جا سکے اور حسی تجربے میں نہ آسکے وہ حقیقی نہیں۔۸۔تسخیر فطرت سے مراد ہے طاقت کا حصول۔یہ اس دور کا سب سے بنیادی اور مرکزی اصول حیات تھا۔انسان کا سب سے بڑا فریضہ یہ قرار پایا کہ طاقت حاصل کرے، خواہ کسی شعبے میں ہو اور کسی طریقے سے ہو' [ص ۴۰-۴۱]

ان سب سے بڑھ کر یہ کہ موجودہ سائنسی ترقی کو اس کی اس اصل حیثیت نیز سرمایہ دارنہ نظام زندگی میں اس کے کردار کو جانے بغیر سمجھنا ممکن ہی نہیں [اس تعلق کی تفصیل کو ہم انشاءاللہ کسی اور مضمون میں بیان کریں گے]۔یہ سائنس اور سرمایہ داری کے تعلق ہی کا مظہر ہے کہ نئی سے نئی خواہشات نفسانی کی تکمیل کے لیے سائنسی عمل کے ذریعے جس نہج پر کائناتی قوتوں کا استحصال کیا گیا وہ کائنات کی وجودی ساخت [ontology] سے مطابقت نہیں رکھتا۔یعنی سائنسی عمل کے ذریعے سرمایہ دارانہ ترقی [growth] کا حصول ماحولیاتی نقطہ نگاہ سے کائناتی قوتوں کا ناجائز استعمال کر کے ہی ممکن ہو سکا ہے، جس کے نتیجے میں انسان خود اوزون کی تہہ پھٹنے اور دیگر خطرنات ماحولیاتی تبدیلیوں سے دوچار ہے۔سائنس کی ہر ایجاد دنیا سے انسان کی محبت تعلق اور لگاؤ میں اضافے کا سبب بنتی ہے اور آخرت فراموشی کا درس دیتی ہے کوئی ایسی

سائنسی ایجاد موجود نہیں جسے دیکھ کر آخرت یاد آئے، دنیا کی زندگی حقیر نظر آئے اور معرفت الٰہی کا ادراک ہو سکے کیونکہ جدید سائنس کی بنیاد آزادی کے فروغ پر رکھی گئی ہے جس کا مادی مظہر محض سرمایہ ہے۔ اس بنیادی تفصیل کے بعد اب ہم ان گمراہیوں کا ذکر کرتے ہیں جو زیادہ واضح اور سمجھنے میں بھی آسان ہیں۔

گمراہی ۱.۲ : عقل وحی پر حاکم ہے

سائنس کا تصور حقیقت قبول کر لینے کا دوسرا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم یہ مان لیں کہ علم کا اصل منبع وحی نہیں بلکہ عقل انسانی ہے، نیز یہ کہ وحی تب ہی معتبر ہوگی کہ جب وہ سائنس کے اصولوں کے مطابق ہو۔ دوسرے لفظوں میں وحی عقل پر نہیں، بلکہ عقل وحی پر حاکم ہے۔ یہ دعوی کہ سائنس کے ذریعے حق تک پہنچنا ممکن ہے اس بات کا اقرار ہے کہ عقل کے ذریعے خیر اور شر، حق اور باطل کا ادراک کر لینا ممکن ہے۔ اور اگر عقل کے ذریعے ایسا کرنا ممکن ہے تو پھر وحی، نبوت اور شریعت بے کار باتیں ہیں جنکی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ یہی وہ رجحانات ہیں جو قرون اسلام میں معتزلہ فرقے کے ہاں پائے جاتے تھے جب انھوں نے عقل کو وحی سے بالاتر گردانا تو خود کو شریعت، نبوت اور وحی سے بے نیاز سمجھنے لگے۔ اور یہ کوئی قصہ پارینہ ہی نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص اس رجحان کا عملی نظارہ کرنا چاہتا ہے تو وہ مغربی فلاسفہ اور ان کے الحادی خیالات پر بننے والے معاشروں کو دیکھ لے کہ جہاں عقل اور سائنس کی غیر منطقی بالادستی کے نتیجے میں فکر آخرت، خوف خدا، للٰہیت، عشق رسول، تقوی، عفت، حیا، زہد، فقر، قناعت وغیرہ جیسے مذہبی حقائق اور اعلی صفات کس طرح مہمل اور بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ اور بدقسمتی یہ ہے کہ اب مسلمان معاشروں میں بھی جدید سائنسی علوم کی اعلی سطح پر بالادستی کی وجہ سے اخروی نجات کے بجائے دنیاوی عیش و آرام، اصلاح و تسخیر قلب نیز علم باطن کے حصول کے بجائے سائنسی ایجادات اور تسخیر کائنات کرنے کی فکر اور رجحانات عام ہوتے جا رہے ہیں جو ایک نہایت خطرناک امر ہے۔

گمراہی ۱.۳ : اسلامی تعلیمات قابل رد ہیں: اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ سائنسی علمیت کو اسلام پر منطبق کرنے کے نتائج کیا نکلتے ہیں۔ اس کوشش کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم یہ مان لیں کہ اسلام کی تمام تعلیمات، بشمول اس کے عقائد، احکامات، اخلاقیات، وغیرہم، اصولی طور پر قابل رد [falsifiable] ہیں۔ یہ اسلیے ضروری ہے کیونکہ فی زمانہ مروج سائنسی معیار علم کے مطابق صرف وہی باتیں اور مفروضات علم کہلانے کے مستحق ہیں جنہیں تجربے اور مشاہدے میں لاکر رد کرنا ممکن ہو [اس کی تفصیل پچھلے مضمون میں ''سائنس کا نظریہ تردیدیت'' کے تحت کی گئی تھی]۔ جو مفروضات تجربے کی روشنی میں ناقابل رد ہوں وہ قطعاً سائنسی علم نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ سائنس اور غیر سائنس میں تمیز کرنے والی شے یہ 'امکان تردید' ہی ہے۔ اب دیکھئے کہ اس بات کی زد کہاں کہاں پڑتی ہے۔ قرآن مجید سورہ بقرہ کے بالکل ابتدائی کلمات میں اپنا تعارف ہی ان الفاظ سے کراتا ہے کہ ذالك الكتاب لاريب فيه یعنی اس میں بیان کردہ حقائق کے غلط

ہونے یا ان میں شک کرنے کا کوئی امکان ہے ہی نہیں ۔ایک شخص کا ایمان اس وقت تک معتبر ہی نہیں ہوتا جب تک وہ اس بات پر کامل ایمان نہ رکھتا ہو کہ اسلام کے بیان کردہ حقائق نا قابل رد ہیں ۔اب علماء خود پڑتال کرسکتے ہیں کہ کیا ایسے شخص کا ایمان کوئی حیثیت رکھتا ہے جو اس بات کے امکان کو بھی مانتا ہو کہ قرآن و سنت میں بیان کردہ حقائق تجربے وغیرہ کی روشنی میں غلط ثابت کیے جاسکتے ہیں؟ لہذا یہ کہنا کہ 'اسلام ایک سائنسی مذہب ہے' ایک مومن کے ایمان پر نقب لگانے کے مترادف ہے۔

گمراہی ۴.۱ : اسلامی تعلیمات حتمی اور دائمی نہیں: دوسری اہم بات جس کی طرف توجہ کرنا لازم ہے وہ یہ کہ کسی علم کے سائنس کہلانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کبھی حتمی اور قطعی نہ ہو۔سائنسی علم وہی ہوتا ہے کہ جس میں ارتقاء[progress□ú] کا عمل اور امکان ہمیشہ جاری رہے۔سائنس میں کوئی بھی حقیقت حتمی نہیں ہوتی ۔اس کے تمام تر حقائق عارضی نوعیت کے ہوتے ہیں یعنی جسے تجربے کی روشنی میں آج حقیقت سمجھ کر مان لیا گیا ہے، ہوسکتا ہے کل کوئی نیا تجربہ اس کی تردید کردے اور وہ بات جسے اب تک حقیقت سمجھا جاتا تھا بدل کر ماضی کی حکایت اور آج کی گمراہی بن جائے ۔اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس میں دریافت شدہ حقائق اس وقت تک کی میسر آنے والی معلومات اور مشاہدات کی روشنی میں ہوتے ہیں اور چونکہ مشاہدات و مدرکات میں تنوع اور وسعت کا امکان ہر لمحہ موجود رہتا ہے، اسلیے سائنس کے ہر اصول وقاعدے میں تبدیلی وتغیر کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ سائنس کی دریافت کردہ کسی بھی حقیقت کو حتمی اور قطعی قرار نہیں دیا جاتا۔ چنانچہ وہ علم جو اس بات کا دعوی کرے کہ اس میں جو بات کہہ دی گئی ہے وہ حتمی، قطعی اور زمان ومکان کی قیود سے آزاد ہے ہرگز سائنس نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ 'اسلام ایک سائنسی مذہب ہے' اس بات کے اعتراف کے مترادف ہے کہ اس میں بیان کردہ تمام حقائق آفاقی اور ابدی نہیں بلکہ عارضی ہیں ۔نیز وقت اور حالات کے تبدیل ہونے سے انکی حقانیت بدل سکتی ہے۔ اب علماء کرام اس بات سے خوب واقف ہیں کہ جو شخص ایسا ایمان رکھتا ہو اس کے ایمان کی حیثیت کیا ہے۔اس قسم کے عقیدے کے بعد ان دعووں میں آخر کیا معنویت رہ جاتی ہے کہ اسلام ایک آفاقی دین ہے اور محمد ﷺ ساری نوع انسانی کے ہر ہر فرد، وقت اور مقام کے لیے راہ ہدایت متعین کرنے والے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں؟ اسلام کو سائنسی علم کی کسوٹی کو پرپرکھنے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ہر سو دوسو سال کے بعد بنیادی عقائد اور احکامات میں تبدیلی لائی جائے اور ہر صدی کے بعد احکام وقوانین از سر نو مرتب کیے جائیں۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے متجددین حضرات آئے دن اجتہاد کے نام پر دین اسلام کی نئی تعبیر وتشریحات پیش کرتے رہتے ہیں اور انہیں علماء کرام سے بھی یہ شکایت رہتی ہے کہ انھوں نے اجتہاد کا دروازہ بند کیوں کردیا ہے۔ ان متجددین کو دراصل یہی غم کھائے جاتا ہے کہ کسی طرح اسلام کو سائنسی علوم [چاہے وہ نیچرل ہوں یا سوشل سائنسز] کے

عین مطابق ثابت کر دکھائیں۔ لیکن شاید وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ اسلام کو جس معیار علم پر منطبق کرنا چاہتے ہیں اس علم میں بذات خود کسی بات کے حق اور باطل پر ہونے کی جانچ کرنے کا کوئی قطعی معیار موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ سوا سو سال کے عرصے میں بلا مبالغہ اسلام کی درجنوں تعبیرات پیش کی جا چکی ہیں اور ہر نئی تعبیر پیش کرنے والے مفکر کا یہی دعوی ہے کہ 'اصل اسلام' تو بس یہی ہے۔ پس سائنس کی اتنی حقیقت جان لینا ہی ایک ہوش مند شخص کی آنکھیں کھولنے دینے کے لیے کافی، مگر چونکہ ذہن سائنس کے سحر اور کفر سے مغلوب ہو چکے ہیں تو اس غلبے کو رفع کرنے کی خاطر ان دلائل کا جائزہ لینا بھی ضروری ہو جاتا ہے جس کے سہارے جدید سائنس کو اسلام کے مساوی یا متبادل حقیقت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

۲] سائنس کو اسلامیانے کے چند دلائل

اب ہم ان دلائل کا جائزہ لیتے ہیں جو ایک حلقہ احباب نے سائنس کو اسلامیانے کی خاطر وضع کر رکھے ہیں۔ ایسے دلائل میں سے چار کی طرف ہم اختصار کے ساتھ اشارہ کیے دیتے ہیں۔

الف] کیا تسخیر کائنات کی سائنسی ذہنیت اسلام نے پیدا کی؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ موجودہ سائنس کی اصل بنیاد قرآن نے ڈالی وہ اس طرح کہ قرآن مجید کے نزول سے پہلے بنی نوع انسانیت مظاہر قدرت [مثلاً آگ، چاند، سورج وغیرھم] کی پرستش میں مبتلا ہونے کی وجہ ان اشیاء کے بارے میں انکا تصور تقدیس تھا۔ اس تقدیس کی بنیادی وجوہات ان مظاہر قدرت سے حاصل ہونے والے فوائد اور مافوق الفطرت اثرات تھے۔ چنانچہ یہ حضرات دعوی کرتے ہیں کہ انسانی تاریخ میں قرآن وہ پہلی کتاب ہے کہ جس نے انسان کو یہ بتایا کہ اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ انسان کے فائدے، استعمال اور خدمت کی خاطر اس کے ماتحت کر دیا گیا ہے۔ اور قرآن کے اس اعلان نے مظاہر قدرت کے بارے میں پائے جانے والی تقدیس کی تمام غلط فہمیوں کی جڑ کاٹ کر انکی تحقیق و تسخیر کے امکان کی راہ ہموار کی اور یہ بات سائنسی ذہنیت پیدا کرنے کے ضمن میں قرآن کی بہت بڑی عطا ہے۔

گمراہی ۱.۲ : پہلے انبیاء کرام کی تعلیمات بنیادی عقائد سے بھی خالی تھیں

اوپر بیان کردہ مفروضے کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو اس دعوے کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہوا کہ آپؐ سے پہلے اللہ کی طرف سے ایک لاکھ سے زائد انبیاء کرام اور بے شمار کتب اور صحائف جو اس دنیا میں بھیجے گئے انھوں نے انسانوں کو یہ نہیں بتایا کہ یہ تمام مظاہر قدرت تمہاری ہی طرح اللہ کی مخلوقات ہیں جنہیں تمہاری خدمت پر معمور کیا گیا ہے۔ کیا کسی مسلمان کے لیے اس بات کا تصور کرنا ممکن ہے کہ گذشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات میں انسان کا اس کے خالق اور کائنات کے ساتھ تعلق جیسی بنیادی باتیں بھی شامل نہیں ہوا کرتی تھیں؟ اگر ان انبیاء نے یہ تعلیمات نہیں دی تھیں تو وہ لوگوں کو کن عقائد کی تعلیم دیتے تھے؟ حالانکہ

قرآن تو واشگاف الفاظ میں کہتا ہے کہ ہر نبی نے اپنی قوم کو شرک سے منع کیا اور اللہ کی عبادت کا حکم دیا۔ اس قسم کے دعوے وہی لوگ کر سکتے ہیں جو سائنس کی تاریخ اور حقیقت سے نہ صرف ناواقف ہی نہیں بلکہ اس سے بے حد مرعوب بھی ہیں۔

ب] کیا قرآنی اصطلاح 'تفکر فی الارض' کا معنی ''تصرف فی الارض میں اضافہ'' ہے؟

سائنس کو اسلامیانے کے ضمن اہم ترین دلیل یہ دی جاتی ہے کہ قرآن مجید میں بار ہا اللہ تعالی نے انسانوں کو مظاہر کائنات، زمین اور آسمان وغیرہ جیسی کئی اشیاء کی طرف غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے، اور چونکہ سائنس اسی غور وفکر کے نتیجے میں تعمیر ہوتی ہے لہذا قرآن کی اس دعوتِ غور وفکر کا مطلب سائنسی علوم کی دریافت کرنا ہی ہے۔ اس دلیل کی بوالعجبی سمجھنے کے لیے صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ غور وفکر کا عمل ایک خاص مقصد کا متقاضی ہے، یعنی اس عمل کی نوعیت، مقدار اور حدود اس مقصد ہی سے طے پاتی ہیں جس کی خاطر غور وفکر کیا جا رہا ہے۔ کیا قرآن غور وفکر کی دعوت تصرف فی الارض کے لیے دیتا ہے یا اللہ تعالی کی معرفت، کائنات کی حقیقت اور آخرت کی یاد دلانے کے لیے پیش کرتا ہے، کیا اس غور وفکر کے نتیجے میں انسان عبد بنتا اور رب کے حضور میں سجدہ ریز ہوتا ہے یا خود معبود بننے کا اعلان کر کے الوہیت انسانی کا فلسفہ پیش کرتا ہے؟

گمراہی ۲.۲ : اصل مقصد انسانی حصول لذت ہے: یہ دلیل اسی صورت میں درست ہو سکتی ہے کہ جب ہم یہ مفروضہ مان لیں کہ کہ قرآن کی دعوتِ 'تفکر فی الارض' کا معنی اور مقصد انسان کو اس کائنات میں زیادہ سے زیادہ تصرف کرنے کی طرف ابھارنا اور اس دنیا سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہونے کی طرف توجہ دلانا ہے۔ وہ اس لیے کہ موجودہ سائنس کا تو مقصد ہی انسان کی زیادہ سے زیادہ خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اس کے تصرف فی الارض میں اضافہ کرنا ہے، جیسا کہ اوپر بتایا گیا۔ انسانی زندگی کے اس مقصد کو حق مانے بغیر قرآنی اصطلاح 'تفکر فی الارض' سے جدید سائنس کا جواز نکالنا ناممکن ہے۔ اور اگر یہ مان لیا جائے کہ قرآن کی اصطلاح 'تفکر فی الارض' کا معنی فی الواقع تصرف فی الارض ہی ہے تو پھر یہ خود بخود مان لیا گیا کہ انسانی زندگی کا مقصد حصول لذت اور اس دنیاوی قیام کو زیادہ سے زیادہ طویل، آرام دہ اور پرلطف بنانا ہے۔ اہل علم پر اس خواہش پرستانہ مقصد حیات کی گمراہی عین واضح ہے اور اسی تصور کو قرآن نے اپنی خواہشات کو اپنا الہ بنا لینے سے تشبیہ دی ہے۔

دعوت غور وفکر کا قرآنی مقصد: اگر آپ قرآن کے ان مقامات کا مطالعہ کریں جہاں وہ 'تفکر فی الارض' کی دعوت دیتا ہے تو انکے مطالعے سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ اسکا مقصد ایک ہی ہے، اور وہ ہے 'اصلاح ایمان'۔ یعنی قرآن یہ چاہتا ہے کہ ان مظاہر قدرت وغیرہ کو دیکھ کر تم میں عاجزی و انکساری پیدا ہو، اپنے رب کی دہشت و ہیبت طاری ہو جائے، تم اپنے رب کے حضور سجدے میں گر پڑو، آخرت میں اس کے

روبرو کھڑے ہونے کے تصور سے تم لرز اٹھو وغیرہ۔ الغرض اس غور وفکر کا مقصد اصلاح ایمان اور جذبہ احکام خداوندی کی اطاعت پر ابھارنا ہے نہ کہ تصرف فی الارض پر ابھارنا۔ ہم ان آیات کو سائنس کا پیش خیمہ ثابت کرنے والے حضرات سے چند سوالات پوچھتے ہیں:

الف] آخر اس بات کی کیا دلیل ہے کہ تفکر فی الارض کا معنی اور مقصد تصرف فی الارض میں لامحدود اضافے کی جدوجہد ہے؟ مثلاً فرض کریں کہ ایک شخص ایک پہاڑ کے سامنے کھڑا اسکا نظارہ کر رہا ہے۔ اب کیا اس دیکھنے کا منطقی اور لازمی نتیجہ یہی ہے کہ اس کے دل میں اس پہاڑ پر چڑھ دوڑنے کی خواہش پیدا ہو؟ یا اسے کھود کر اس میں سے معدنیات نکالنے کا خیال آئے؟ آخر کس منطق کی رو سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہے کہ غور وفکر کا مقصد بس تسخیر اور تصرف فی الارض ہی ہوتا ہے اور ہونا بھی یہی چاہئے؟

ب] کیا اسلامی تاریخ میں کسی معتبر مفسر قرآن نے ان آیات سے موجودہ سائنس کے جواز کی طرف اشارہ کیا ہے؟

غور وفکر کی نوعیت اور مقصدیت کا تعلق: اس بات کو سمجھنا نہایت ضروری ہے کہ اصلاح ایمان واطاعت اور تصرف فی الارض میں اضافے کا مقصد یکساں نوعیت اور مقدار کی غور وفکر کی راہیں نہیں دکھاتے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ فرض کریں آپ کمرہ امتحان میں پرچے کی فکر میں غلطاں بیٹھے ہیں اور کوئی شخص آپ کے سامنے پانی کا گلاس رکھ کر کہتا ہے کہ اس پر غور کرو۔ ان حالات میں غور وفکر کا جو نقشہ آپ کے ذہن میں تشکیل پائے گا وہ اتنا ہی ہوگا کہ ''کیا اس پانی سے میری کوئی ایسی ضرورت پوری ہوتی ہے جو مجھے پرچہ حل کرنے میں مدد دے؟''۔ آپ کے ذہن میں یہ سوالات ہی پیدا نہیں ہوں گے کہ یہ پانی کن گیسوں کا مرکب ہے؟ ان گیسوں کی خصوصیات کیا ہیں؟ ان گیسوں کے باہمی ملاپ سے اور کیا شے ترتیب دی جاسکتی ہے؟ وجود میں آنے والا نیا مرکب کس طرح میری ایک نئی خواہش کی تکمیل کا باعث ہوسکتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ پورے غور وفکر کے بعد بھی پانی آپ کے لیے محض پیاس بجھانے کا ایک آلہ ہوگا۔ غور وفکر کے بعد پانی کی یہ حیثیت بھی صرف اس لیے متعین کی گئی کیونکہ یہ اصل مقصد [امتحان میں کامیابی] حاصل کرنے میں مددگار ہے۔ لیکن اگر کمرہ امتحان میں کوئی شخص آپ کے سامنے کسی مصور کی بنائی ہوئی دریا وغیرہ کی تصویر، کسی فٹبال یا کرکٹ میچ کی تفصیلات وغیرہ رکھ کر کہے کہ اس پر غور کرو تو آپ بغیر کسی جھجک اور ضائع وقت کے یہ کہہ کر انہیں اٹھا کر باہر پھینک دینگے کہ یہ لغو اور بیکار چیزیں ہیں۔ اب فرض کریں کہ ایک شخص آپ کے سامنے ایک پرچہ رکھ کر کہتا ہے کہ تمہارے تمام سوالوں کا جواب اسی ایک صفحے میں لکھا ہوا ہے، لہٰذا اس پر غور کرو۔ اب کیا آپ کے غور وفکر کی نوعیت اس صفحے کے ساتھ بھی ویسی ہی ہوگی جیسی پانی یا کھیل کی تفصیلات وغیرہ کے ساتھ تھی؟ ہرگز نہیں، بلکہ آپ اس کے ہر ہر لفظ، عبارت اور جملے پر غور کریں گے تاکہ اصل مقصود حاصل ہوسکے۔ ان

تینوں چیزوں کے ضمن میں جو چیز آپ کے غور وفکر کے رویے، نوعیت اور مقدار میں تغیر کا باعث بنی وہ ان چیزوں کا آپ کے مقصد کے ساتھ ربط اور تعلق ہے۔ چنانچہ جس چیز اور بات کا تعلق آپ کے مقصد کیساتھ جس قدر مضبوط ہوگا اسی قدر وہ آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگی۔ پس اسی اصول پر جانچ لینا چاہئے کہ یہ دنیا امتحان گاہ ہے جہاں انسان کو ایک قلیل مدت کے لیے رہ کر اپنے رب کے حضور پیش ہو جانا ہے جہاں اس دنیا میں گزارے ہوئے ایک ایک لمحے کا حساب دینا ہوگا اور یہ حساب جس بنیاد پر ہوگا وہ نبی ﷺ کے ذریعے انسانوں کو بتا دیا گیا ہے۔ پس اب اگر کوئی شخص اصل مقصد کو چھوڑ کو دنیا کے قیام کو زیادہ پر مسرت بنانے کو ہی اپنا مقصد بنا لے اور اسی علم کے لیے ساری تگ ودو اور غور وفکر کرتا پھرے جو اس مقصد میں مددگار ہو تو اس سے زیادہ گھاٹے کا سودا آخر کون کرتا ہوگا؟ اگر دنیا سے متمتع ہونے کی صحیح مقدار کا تعین کرنا ہو تو کتب احادیث میں **کتاب الذھد** اور **کتاب الرقاق** کا مطالعہ کرنا چاہئے جہاں مختلف الفاظ و پیراؤں میں دنیا کی اصل حقیقت اور اس سے متمتع ہونے کی حدود کھول کھول کر بیان فرما دی گئی ہیں۔ مثلاً کہیں کہا جاتا ہے کہ **کن فی الدنیا کانک غریب او عابر السبیل** [یعنی دنیا سے اتنی ہی دلچسپی رکھ اور اس میں اسطرح زندگی گزار کہ جیسے ایک مسافر یا [اس سے بھی بڑھ کر جیسے ایک] رہ گزر زندگی بسر کرتا ہے]۔ نیز یہ بات رسول اللہ ﷺ، آپ ﷺ کے خلفاء راشدین، صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہم اور اولیاء کرامؒ کے حالات اور طرز زندگی سے بھی با آسانی سمجھی جاسکتی ہے کہ دنیا سے متمتع ہونے کا جائز طریقہ کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان پاک ہستیوں نے سائنس جیسے علم کے لیے اپنی زندگیوں کے قیمتی لمحات کیوں نہ صرف کئے؟ چنانچہ اصلاح ایمان اور جذبہ اطاعت سے نکلنے والے غور وفکر کی نوعیت، طریقہ اور نتائج وہی نکلتے ہیں جو ان لوگوں کی زندگیوں میں نظر آتے ہیں جنہیں قرآن نے منعمین [انعام یافتہ] کہا ہے اور جنکے طریقے کو اصل دین قرار دے کر انکی پیروی کا نہ صرف حکم دیا ہے بلکہ ہر نماز میں ان کی پیروی کے حصول کی دعا مانگنے کی تعلیم دی ہے [صراط الذین انعمت علیھم]۔ اس کے مقابلے میں تصرف فی الارض کے جذبے سے تشکیل پانے والے غور وفکر کا نتیجہ بعینہ وہی نکلتا ہے جو آئن سٹائن اور کانٹ نیز ان جیسے افراد کے خیالات کی پیری کرنے والے مغربی معاشروں کے غلیظ طرز زندگی میں نظر آتا ہے۔

اسلامی علوم کی درجہ بندی میں سائنس کی حیثیت: بعض حضرات کا خیال یہ بھی ہے کہ سائنسی طریقے کو اگر اس کے مقصد، تصرف فی الارض، سے علیحدہ رکھ کر دنیاوی امور کے لیے بطور آلہ استعمال کیا جائے تو ایسی سائنس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن یہ بات ان معنوں میں عجیب ہے کہ سائنس کو اس کے مقصد سے علیحدہ کرنے کے بعد جو شے باقی بچے گی وہ سائنس نہیں ہوگی۔ اور فرض کریں ہم بطور بحث ایک لمحے کے لیے اس بات کو مان بھی لیتے ہیں، لیکن پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علوم اسلامیہ کی درجہ بندی میں اس کی حیثیت و مقام کیا

ہوگا؟ اسلام میں کسی علم کے جائز ہونے کا یہ مطلب کہاں سے نکل آیا کہ:

[الف] اب اسی علم کو اصل دین اور مقصد بنالیا جائے؟ [ب] معاشرے کی تعمیر بھی اسی علم کی بنیاد پر ہونے لگے؟ [ج] زندگی کی معنویت، افراد و معاشرے کی کامیابی و ناکامی کے معیارات بھی اسی علم کے حصول سے ملحق کر دیئے جائیں؟ [د] معاشرے کے سارے افراد اصل علم کو چھوڑ کر محض اس جائز علم کے حصول کی فکر میں لگ جائیں؟ [ھ] ریاستی سرپرستی بھی محض اسی علم کو حاصل ہونی چاہئے؟ نیز یہ ریاست کا بنیادی وظیفہ ٹھہرے کہ وہ افراد کو اس علم کے حصول کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے؟

جواز، طلب، وجوب کے مدارج: جو افراد قرآن سے سائنسی معلومات کا اثبات کرتے ہیں کیا وہ اتنی بات سے بھی ناواقف ہیں کہ کسی چیز کے جواز، طلب اور وجوب میں زمین آسمان کا فرق ہے؟ سوال یہ ہے کہ محض جواز سے وجوب کیسے لازم آیا؟ اہل علم اس بات سے خوب واقف ہیں کہ جو شے ضرورتاً جائز ہو وہ بس اسی قدر جائز ہوتی ہے کہ جس سے ضرورت پوری ہو سکے، نہ یہ کہ وہ مقصد ہی بن جائے۔ لیکن ہمارے مفکرین بڑے عجیب تضاد کا شکار ہیں، کہ دلیل تو وہ صرف سائنس کے جواز کی دیتے ہیں، مگر اس کے ساتھ معاملہ صرف وجوب ہی کا نہیں، بلکہ فرض عین کا سا کرتے ہیں۔ اگر علوم اسلامیہ کی صحیح ترتیب دیکھنا ہو امام غزالیؒ کی کتاب احیاء العلوم الدین کے کتاب العلم کا مطالعہ کر لینا چاہئے جس کے بعد یہ سمجھ لینا آسان ہو جاتا ہے کہ علوم عقلیہ کی اگر کوئی حیثیت ہے بھی تو کس درجے پر ہونی چاہئے۔ امام صاحب کے اصول علم کی اگر صرف تلخیص ہی بیان کی جائے تو ایک پوری کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ان میں سے چند بطور نمونہ یہ ہیں کہ ایک فرد کی یہ اولین ذمہ داری ہے کہ سب سے زیادہ توجہ وہ علم باطن [یعنی تزکیہ قلب] کے حصول کی طرف کرے کہ یہی علم تمام علوم کی اصل غرض و غایت و منتہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کم از کم ان احکام شریعت کے متعلق لازماً علم حاصل کرے کہ جن کا وہ مکلّف ہو چکا ہے یا ہونے والا ہے۔ پھر جب ان علوم سے فراغت نصیب ہو تو ان پیشوں کی طرف توجہ کرے جو فرض کفایہ ہیں اور جو اسلامی معاشرے کی اجتماعی تنظیم میں مددگار ہیں اور مخلوق خدا کو جنکی ضرورت ہے [مثلاً طب، زراعت، صنعت وغیرہ]۔ جی چاہتا ہے کہ امام صاحب کی کتاب العلم کی تلخیص بیان کریں، مگر نفس مضمون اس کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ اگر کوئی فرد اصل شے اور مقصود علم اور ضروری احکام شریعت سے تو کلیتاً نابلد ہو اور محض سائنسی علوم کے حصول کی فکر میں گھلتا رہے اور زندگی برباد کر دے تو ایسے شخص کی عقل پر اگر ماتم نہ کیا جائے تو اور کیا کیا جائے؟ یہ تو ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص کمرہ امتحان میں پرچہ حل کرنے کے بجائے کرکٹ میچ کی تفصیلات جاننے کی فکر میں گھل رہا ہو یا کوئی بچہ اسکول میں داخلہ لینے کے بعد اپنا سبق پڑھنے کے بجائے سارا وقت اسکول کے میدان میں کھیل کود کر صرف کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص ناکام نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟

پس جدید سائنسی علوم کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ یہ افراد اور معاشروں میں دنیا کی فکر کو آخرت کی فکر پر غالب کرنے یا فکر آخرت کو بھول جانے کا درس دیتے ہیں اور ترتیب مقاصد کی یہی تبدیلی درحقیقت معصیت خداوندی کا اصل محرک ہے جسکا نتیجہ لازماً آخرت کی ناکامی کی صورت میں نکلے گا۔ مگر اصولی بات وہی ہے کہ جو اوپر کہی گئی کہ اسلام میں جدید سائنس کا کوئی جواز موجود نہیں کیونکہ جدید سائنس تو سراپا کفر ہے اور یہ صرف کفر ہی کے بطن سے برآمد ہوسکتی ہے۔ امام غزالیؒ کے اصولوں کی روشنی میں جدید سائنس کا شمار مضر علوم کی فہرست میں ہوگا۔ جواز کی ایسی صورتیں صرف وہی لوگ نکالتے ہیں جو سائنس کی حقیقت سے واقف نہیں۔ ایسے حضرات درحقیقت شریعت کو طریقت سے علیحدہ رکھ کر دیکھتے ہیں، اور شریعت کے اندر رہتے ہوئے دنیاوی عیش وعشرت کا جواز فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ شریعت میں تو بعض غیر مطلوب اعمال کا جواز نیز رخصتیں بھی موجود ہوتی ہیں، لیکن یہ طریقت ہی ہے جو مطلوب ومقصود اور احسان کا راستہ دکھاتی ہے۔

سائنسی علوم اور سرمایہ داری: اور یہ بات بھی یاد رہے کہ اسلام میں مغربی سائنس کا جواز پیدا کرنے کا فائدہ اسلام کو ہو یا نہ ہو مگر اس کا سب سے زیادہ فائدہ سرمایہ داری کو ہوتا ہے وہ اس لیے کہ سائنسی علمیت کی بنیاد پر جو نظام زندگی قائم ہوتا ہے وہ عملاً سرمایہ داری ہی ہے۔ مغربی سائنس کا سرمایہ دارانہ نظام زندگی سے تعلق اس قدر واضح ہے کہ مغربی مفکرین بذات خود سائنس کو سرمایہ داری کا آلہ کار کہتے ہیں، جیسا کہ ہم نے اپنے پچھلے مضمون کے آخری حصے میں اشارہ کیا تھا۔ اس تعلق کو ایک جملے میں یوں ادا کیا جاسکتا ہے کہ سرمایہ داری نام ہے تکمیل خواہشات کے لیے بڑھوتری سرمائے کو بطور مقصد حیات کے قبول کرنے کا، اور سائنس [بشمول طبعی اور سوشل سائنسز] وہ طریقہ کار ہے جو اس مقصد حیات کو عملی شکل دینے کے امکان پیدا کرتا ہے۔ اس تعلق کی تفصیلی علمی بنیادیں تو اس مضمون میں بیان نہیں کی جاسکتیں لیکن اگر آپ اس دعوی کو عملی زندگی میں دیکھنا چاہتے ہیں تو یورپ اور امریکہ نہ جایئے، ذرا اپنے معاشرے کے سرکاری ونجی کالجز اور یونیورسٹیوں میں جا کر سائنس اور ٹیکنالوجی، سوشل سائنسز اور بزنس ایڈمنسٹریشن وغیرہ کے طلباء کے ساتھ چند دن گذار آیئے آپ کو ہماری بات کا یقین ہو جائے گا کہ ان علوم میں سرائیت کی ہوئی سرمایہ داری نے کس طرح ہمارے طلباء کو اپنے شکنجے میں کس لیا ہے۔ ان طلباء و طالبات کے موضوعات گفتگو، ذاتی کردار، شوق وترجیحات، انداز لباس دیکھ کر اللہ کا غضب تو یاد آ سکتا ہے مگر کسی بھی طرح ایک مسلمان کا نقشہ ذہن میں نہیں آتا۔ اعلی معیار زندگی کے حصول کے لیے بڑی تنخواہوں والی نوکریاں ہی انکی زندگیوں کا اصل مقصود ہیں۔ اب بھی اگر کوئی کہے کہ سائنس اور اسلام ایک ہی حقیقت کو تلاش کرتے ہیں تو ہم یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ آخر دونوں نظام ہائے علم سے دو متضاد قسم کی شخصیتیں کیوں وجود میں آتی ہیں؟ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا سائنس وٹیکنالوجی کی بالادستی پر قائم ہونے والے نظام علم کی دنیا میں اپنی زندگی کے پندرہ سال گزارنے کے بعد

ایک طالب علم میں للّٰہیت، محبت رسولﷺ، شوق عبادت، طہارت، تقویٰ، خوف آخرت، عفت، حیا، غیرت، ایثار، شوق شہادت، توکل، صبر، عزیمت وغیرہ کی صفات پیدا ہونے کا کوئی ذرہ بھر امکان بھی ہوتا ہے؟ سب جانتے ہیں کہ عمر عزیز کا اسقدر طویل حصہ صرف کرنے کے بعد بھی اس متاع عظیم میں سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اس کے مقابلے میں اس دنیا کے شہسواروں میں خود غرضی [اپنے مقصد کے لیے دوسروں سے تعلقات قائم کرنا]، حرص [زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی خواہش]، حسد [دوسروں سے زیادہ دولت کی خواہش]، دنیا کی بے پناہ محبت [طویل العمری کی خواہش اور موت سے کراہیت]، غضب [دوسروں کو زیر کرنے کی خواہش، جسے علم معاشیات نے مسابقت یعنی Competition کا خوبصورت نام دے رکھا ہے]، لذت پرستی [خواہشات نفسانی کی بندگی]، عبادات کو حقیر جاننا، ضیاع اوقات، گناہ کے کاموں کو تفریح سمجھنا، کلام لغو [جو فحش گوئی، کھیل تماشوں، فلموں، ٹھٹھے بازی اور جنس مخالف کے موضوعات سے پر ہوتا ہے] وغیرہ کے اوصاف کا پیدا ہو جانا ایک فطری عمل ہے۔ پس آخر ہم کیسے مان لیں کہ سائنسی علم بھی اسی منزل کی طرف لے جاتا ہے جہاں اسلام لے جانا چاہتا ہے؟ اگر کسی شخص نے ابھی تک جہنم کا نام جنت نہیں رکھا ہے تو اسے اس سوال کا جواب دینا ہی ہوگا۔

کیا سائنس نے شریعت پر عمل کرنا آسان بنایا ہے؟ سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ کیا جدید سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی نے شریعت پر عمل کرنے میں آسانیاں پیدا کی ہیں یا مشکل؟ اس ضمن میں ایک عام خیال یہ پایا جاتا ہے کہ سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے نتیجے میں وقت کی کفایت ہوتی ہے۔ مثلاً تیز رفتار سواریوں کے بعد سفر کرنے میں وقت کم لگتا ہے، لہٰذا عبادات کے لیے وقت زیادہ بچتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ تجزیہ نہایت عامیانہ ہے۔ وہ اس لیے کہ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ سائنس و ٹیکنالوجی کے نتیجے میں بننے والے سواریوں نے 'وقت فی کلومیٹر سفر' [time required to cover one km distance] تو کم کر دیا ہے، یعنی پہلے جو سفر کئی مہینوں میں ہوتا تھا اب وہ چند گھنٹوں میں طے کیا جا سکتا ہے، مگر اس کے نتیجے میں ہماری زندگیوں میں سفر پر صرف ہونے والا 'اوسطاً یومیہ وقت سفر' [time spent on travelling per day] کم ہونے کے بجائے بڑھ گیا ہے۔ مثال کے طور پر آپ اس بات پر غور کریں کہ ایک گاؤں میں رہنے والا شخص ایک ہفتے یا مہینے میں کتنے گھنٹے سفر پر خرچ کرتا ہے اور شہری شخص کتنے گھنٹے سفر کرتا ہے۔ واضح طور پر آپ دیکھیں گے کہ شہری شخص بہ نسبت گاؤں کے رہائشی کے اوسطاً زیادہ گھنٹے سفر کرتا ہے [شہری زندگی میں ایک شخص کو بازار، نوکری، رشتے دار نیز ہر جگہ جانے کے لیے سفر پر سفر کرنا پڑتا ہے]۔ تیز رفتار سواریاں بننے کے نتیجے میں اوسط وقت سفر تب کم ہوتا کہ جب لوگوں کی سفر کی ضروریات اتنی ہی رہتیں کہ جتنی پہلے تھیں، لیکن ان سواریوں کے بعد لوگوں کی سفری ضروریات تیزی سے بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں۔ اور ایسا ہونا اس لیے

ضروری ہے کہ سائنس و ٹیکنالوجی کی ساری ترقی جس سرمایہ دارانہ عمل [جسے profit-maximization کہتے ہیں] کے نتیجے میں ظہور پزیر ہورہی ہیں اسکا بنیادی تقاضا یہی ہے کہ لوگوں کی سفری ضروریات روز بروز بڑھتی ہی چلی جائیں [مثلاً ائیر لائنز کا منافع اسی بات پر منحصر ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ سفر کریں وغیرہ]۔ ان حالات میں یہ کہنا کہ ان سواریوں نے عبادات وغیرہ پر عمل کرنے کے لیے وقت بچادیا ہے محض خام خیالی ہے۔ اتنی بات تو ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی جانتا ہے کہ زیادہ دنیاوی کاروباری معاملات سنبھالنے کے لیے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے، تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہر لمحہ بڑھنے والی سائنسی ٹیکنالوجی سے بننے والے ضروریات زندگی نیز خود اس ٹیکنالوجی کو برقرار رکھنے کے لیے کم وقت درکار ہوگا؟ آپ مغربی دنیا کے کسی ترقی یافتہ ملک کا چکر لگا آئیں، آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ ٹیکنالوجی کے نت نئے معیارات نے کیسے انسانوں کو اپنی جکڑ میں لے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پس جدیدی [post-modern] مغربی مفکرین کا کہنا ہے کہ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں جدیدیت نے سائنس و ٹیکنالوجی کے ذریعے انسانوں کو آزادی دلانے کا جو سنہرا خواب دکھایا تھا وہ نہ تو اب تک پورا ہوا ہے اور نہ ہی سائنس کے ذریعے پورا ہونا ممکن ہے کیونکہ یہ انسان کو نئے قسم کی جکڑ بندیوں کا شکار کردیتی ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے ذریعے حاصل ہونے والی جتنی آسانیاں گنوائی جاتی ہیں وہ عام طور پر ایسے ہی عامیانہ تجزیے پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ہمیں تو کہیں نظر نہیں آتا کہ سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے بعد نماز فجر میں مسجدیں نمازیوں سے بھرنے لگی ہوں۔ اور اگر بالفرض چند اعمال ایسے بتا بھی دیئے جائیں جن پر عمل کرنے میں آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں تو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ شیطان کے سواء کوئی بھی شے شر محض نہیں ہوتی، دنیا کی ہر شے میں کوئی نہ کوئی فائدہ تو دکھایا جا ہی سکتا ہے۔ ایسے فوائد تو جادو میں بھی پائے جاتے ہیں، لیکن کیا ایسے چند فوائد کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں کو اپنا نظام زندگی جادو کے علم پر تعمیر کرنا چاہئے؟ اصل بات تو یہ ہے کہ جدید سائنس و ٹیکنالوجی جو مقصد زندگی [تصرف فی الارض] افراد اور معاشرے میں عام کرتی ہیں اس کے بعد لوگوں میں فکر آخرت پروان چڑھتی ہے یا فکر دنیا؟

کیا سائنس کے ذریعے دنیاوی ترقی نہ کرنا مسلمانوں کا نقصان ہے؟

تصرف فی الارض میں اضافے کے لیے ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ اہل مغرب نے جدید سائنس کے ذریعے دنیاوی ترقی حاصل کرلی، جبکہ مسلمان اس سے غفلت کی بنا پر دنیا میں پیچھے رہ گئے۔ اگر مسلمان بھی اہل مغرب کی طرح سائنس بناتے تو دنیا میں ترقی اور عروج حاصل کرلیتے وغیرہ وغیرہ۔ اس دعوے کی مضحکہ خیزی دیکھنے کے لیے ایک مثال پر غور کریں۔ فرض کریں سلیم مدینے کے سفر پر روانہ ہوتا ہے اور ممتاز نیویارک کے، نیز سلیم اور ممتاز دونوں کو دوسرے شخص کی منزل مقصود سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اب اگر

اپنی اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد سلیم سے پوچھا جائے کہ تم نے نیویارک پہنچنے کا سامان کیوں مہیا نہ کیا، تو اس پر سلیم کا جواب سوائے اس کے اور کیا ہوگا کہ بھائی مجھے نیویارک جانا ہی نہیں، میری منزل تو پہلے دن سے مدینہ ہی تھی۔ پس اسی طرح جب یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے جدید سائنس کیوں ایجاد نہ کی تو اسکا جواب بھی یہی ہے کہ محبت دنیا مسلمانوں کا مقصود تھا ہی کب کہ اس کے لیے جدید سائنس بنانے کی جدوجہد کرتے۔ ہماری علمیت کا تو اصل سوال ہی یہ ہے کہ میرے رب کی رضا کس شے میں ہے نیز مرنے کے بعد میں کس طرح جنت میں داخل ہوسکوں گا۔ پوری اسلامی علمیت انہیں سوالات کے گرد گھومتی ہے۔ اس کے مقابلے میں جدید سائنس کو ان سوالات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں، اس کے نزدیک تو اصل مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح انسان اس دنیا سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہوسکتا ہے۔ اگر اسلامی علمیت کو بغور دیکھا جائے تو تین چیزوں کو مشتمل ہے [علمائے کرام نے ان تینوں کی تخریج حدیث جبرئیل سے کی ہے]: [۱] علم الکلام [عقائد اور ایمانیات] [۲] علم الفقہ [احکامات عملی] [۳] علم الاحسان [تصوف یا علم باطن]

ان تینوں علوم میں سے کسی بھی علم میں سائنس کو ہرگز کوئی وقعت نہیں دی گئی۔ سائنس کی بالادستی کا مطلب یہی ہے کہ ہم ان علوم کو عبث قرار دیں، کیونکہ جب تک علم الکلام، فقہ اور احسان کی معاشرتی بالادستی قائم رہے گی جدید سائنس کے پنپنے کا کوئی امکان پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہ بات بھی اہم طور پر نوٹ کرنے کی ہے کہ تاریخ اسلام میں معتزلہ ایک ایسا گروہ تھا جو یونانی فکر سے متاثر ہوکر بعینہ انہیں خطوط پر چل نکلا تھا جنہیں سولہویں اور سترہویں صدی میں مغربی مفکرین اور سائنس دانوں نے اپنایا۔ اگر امام غزالیؒ نے اس معتزلی فکر کے طوفان کے آگے بند نہ باندھا ہوتا تو آج اسلام اور مسلمانوں کا حال بھی وہی ہوتا جو یورپ میں عیسائیت کا ہے۔ عیسائیت اور اسلام کی تاریخ میں یہی فرق ہے کہ عیسائیت کو کوئی امام غزالیؒ نصیب نہ ہوا کہ جو جدیدیت کو شکست دے کر عیسائی علوم کا بول بالا کرتا۔ افسوس کے جس اعتزال سے امام غزالیؒ نے اسلام کو بچایا، آج ہمارے مفکرین اسی اعتزال کو عین اسلام ثابت کرنے پر مصر ہیں۔ اس بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ مغرب نے جو عروج حاصل کرلیا ہے اسکا راز جدید سائنسی ترقی ہے، لہذا مسلمانوں کو بھی عروج حاصل کرنے کے لیے جدید سائنسی ترقی کرنا چاہئے۔ بات کا یہ پہلو درحقیقت فلسفہ عروج وزوال سے تعلق رکھتا ہے، لہذا ہم طوالت مضمون سے بچنے کے لیے اس سے اعراض کرتے ہیں۔ [ساحل کے ۲۰۰۵ اور ۲۰۰۶ کے اکثر شماروں میں اس موضوع پر کافی مواد مل سکتا ہے۔

کیا سائنس کا مقصد فلاح انسانیت ہے؟ جدید سائنس سے عدم واقفیت کی بناء پر اس کے جواز کے لیے ایک رویہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ جدید سائنس کا مقصد بنی نوع انسانیت کی فلاح ہے۔ یہ فلاح کا لفظ بھی آج کل خوب چل نکلا ہے اور ہر شخص نے اپنا اپنا نظریہ فلاح بنا رکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ فلاح سے مراد کیا ہے؟ اگر کسی کے نزدیک

فلاح سے مراد لذت پرستی اور دنیاوی عیش وعشرت ہی ہے تو اسے ایسی فلاح مبارک ہو، مذہب کے نزدیک تو کامیابی اور فلاح یہ ہے کہ انسان اپنے رب اور اس کے انبیاء کی تعلیمات پر ایمان لائے اور ان پر عمل پیرا ہو کر اپنے رب کی رضا حاصل کر کے جنت میں داخل ہو جائے [قرآن میں بلاکسی استثناء کے ہر جگہ لفظ 'فوز' [کامیابی] انہیں معنوں میں استعمال ہوا ہے]۔ اس کے مقابلے میں جدید سائنس کے نظریہ فلاح میں یہ تمام حقائق بے وقعت اور بے معنی ہیں۔ فلاح کے نام پر سائنس کا جواز اس وقت تک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا کہ جب تک فلاح سے مراد وہی شے نہ فرض کی جائے جسے آج سائنس اور معاشیات میں welfare کہا جاتا ہے۔

ج] ایک تاریخی دلیل: سائنس کو اسلامیانے کے لیے ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ موجودہ سائنسی علوم کے اصل خالق تو مسلمان تھے جو ہسپانیہ کی یونیورسٹیوں کے ذریعے یورپ میں پہنچے۔ یہ دعوی کہ مغربی سائنس مسلمانوں کی کاوشوں کا تاریخی تسلسل ہے دلیل کم اور غلط فہمی زیادہ ہے اور اسکا ازالہ ذرا تفصیل طلب ہے۔ [اس موضوع پر علامہ سید سلیمان ندویؒ کے افادات ملاحظہ کیجیے جو ساحل جون ۲۰۰۶ء میں امالی غلام محمد کے نام سے شائع ہوئے ہیں] اس مضمون کے بعد ہم نے اسی موضوع پر ایک مستقل تحریر لکھنے کا ارادہ کیا ہے اور اگر اللہ تعالی کی توفیق شامل حال رہی تو اس پر اور سائنسی فلسفہ عروج پر تفصیلی کلام انشاء اللہ ہم اپنے اگلے مضمون میں کریں گے۔ فی الحال ہم چند دیگر اہم دلائل کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

د] کیا استقرائی منطق [Inductive Logic] کا خالق قرآن ہے؟ سائنس کو اسلامیانے کے ضمن میں تمام دعووں میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز دعوی یہ کیا جاتا ہے کہ سائنسی علم کی بنیاد تجربے اور مشاہدے پر مبنی استقرائی منطق کے اصول پر قائم ہے اور قرآن وہ پہلی کتاب ہے جس نے اپنی دعوت کے استدلال کے لیے استقرائی منطق کا اسلوب اختیار کر کے نوع انسانیت کو اس انوکھے اور اہم طریقہ تحقیق سے روشناس کرایا۔ اور درحقیقت یہی قرآنی طرز استدلال انسانی فکر میں ترقی کا باعث بن کر جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کا پیش خیمہ بنا۔ اس موقع پر اس دعوے پر کسی قسم کا کلام کرنا بھی وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے کیونکہ ہمارے پچھلے مضمون میں استقرائی منطق اور اس کی علمی کمزوریوں پر تفصیلی بحث جن حضرات کی نظر سے گزری ہے ان پر اس کی لغویت عین واضح ہے۔ نیز یہ دعوی کہ جدید سائنسی ذہنیت قرآن کی عطا ہے ان معنوں میں ایک مبہم دعوی ہے کہ اس جملے میں سائنسی ذہنیت سے مراد کیا ہے؟ ابتدائی مضمون میں ہم نے سائنسی علم کے کم از کم چار فرقوں کے خیالات کی تلخیص بیان کی تھی [۱] استقرائیت، [۲] تردیدیت، [۳] ساختیت اور [۴] انارکسٹ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سائنسی ذہنیت سے ان چاروں میں سے کونسی ذہنیت مراد ہے؟ اس دعوے کی غلطی یہ ہے کہ اس میں سائنس کو استقرائیت کے مترادف سمجھ لیا گیا ہے جبکہ یہ حقیقت ہے ہی نہیں۔ ایسے دعوے کرنے والے حضرات سائنس کی تاریخ اور حقیقت سے نابلد ہیں اور وہ سائنسی علم کی

صرف اسی تفسیر و توجیہ سے واقف ہیں جسے بیسویں صدی کے اوائل ہی میں سائنس دانوں نے رد کر دیا تھا ۔اس ضمن میں یہ بات بھی اہم ہے کہ استقرائی منطق میں مشاہدے کے ذریعے حاصل ہونے والا نتیجہ پہلے سے معلوم نہیں ہوتا، یعنی مشاہدہ نتیجے سے قبل ہوتا ہے ۔ نیز استقرائی منطق کے مطابق علم کی اصل بنیاد مشاہدہ ہے ۔اس کے مقابلے میں قرآن جب مشاہدے کی بات کرتا ہے تو نتیجہ پہلے ہی طے کر دیتا ہے یعنی وہ یہ کہتا ہے کہ اس مشاہدے میں تمہیں اللہ کی نشانیاں نظر آنی چاہیے ۔ دوسرے لفظوں میں مشاہدے کا نتیجہ اور طرز عمل دونوں ہی پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں اور ہر وہ مشاہدہ جس کا نتیجہ وہ نا ہو جو قرآن نے بتایا ہے تو وہ غلط ہے ۔ دوسری بات یہ کہ اسلام میں علم کا حتمی معیار اور بنیاد بذات خود قرآن و حدیث ہیں نا کہ انسانی تجربہ ۔اس فرق عظیم کے بعد استقرائی منطق کو قرآن پر منطبق کرنا اسی شخص کا کام ہوسکتا ہے جو استقرائی منطق کی حقیقت سے ناواقف ہو۔

ھ] ایک آخری دلیل : استقرائیت اور کتاب ہدایت کا تعلق

اسی ضمن میں ایک اور قابل غور بات یہ ہے کہ اس انوکھی دلیل کو پیش کرنے والے حضرات کا یہ بھی دعوی ہے کہ قرآن سے پہلے دنیا جس واحد استدلال کے اسلوب سے واقف تھی وہ یونانیوں کی استخراجی منطق [Deductive logic] تھی جو اپنی ساخت کی پیچیدگی کے اعتبار سے نا صرف یہ کہ ایک عام انسانی ذہن سے میل نہیں کھاتی ، بلکہ قرآن جیسی کتاب کے بنیادی مقصد [دعوت و ھدایت للناس] کے لیے بھی موضوع نہیں ۔اسی لیے اللہ تعالی نے قرآن میں اس پیچیدہ طرز اسلوب کو اختیار کرنے کے بجائے استقرائی منطق کا اسلوب اپنایا جو ایک عام انسانی ذہن کے لیے آسان اور زیادہ قابل فہم ہے ۔

گمراہی ۲.۳ : پہلی آسمانی کتب میں سرے سے کوئی استدلال تھا ہی نہیں

اس تقریر پر ہمارا الزامی سوال یہ ہے کہ اگر دنیا میں استدلال کے صرف دو ہی اسلوب ہیں [استقرائی اور استخراجی] تو قرآن سے پہلے جتنی آسمانی کتب و صحف نازل کی گئیں ان کا طرز استدلال کیا تھا؟ اگر یہ مان لیا جائے کہ استقرائی منطق کو متعارف کرانے کا سہرا قرآن کے سر ہے تو لامحالہ دو میں سے کوئی ایک بات ماننی پڑے گی: [الف] انکا اسلوب استخراجی تھا ۔مگر اس صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ ایک پیچیدہ طرز اسلوب ہے تو پہلے کی امتوں میں اسے کیوں اپنایا گیا جبکہ آپ حضرات کے بقول تو اس وقت انسانیت کا اجتماعی ذہن ابھی اپنے عہد طفولیت سے گزر رہا تھا؟ اس حساب سے تو وہ لوگ اس بات کے زیادہ حق دار تھے کہ ان کے لیے اس مشکل اسلوب سے گریز کیا جاتا ۔ نیز اگر استخراجی منطق کا اسلوب کتاب ھدایت کے ساتھ میل نہیں کھاتا تو کیا پہلے کی امتوں کی طرف نازل کی جانے والی کتب کا مقصد ہدایت کے علاوہ کچھ اور ہوتا تھا؟ اگر اسکا جواب نفی میں ہے تو پھر انکی کتب ھدایت میں اس اسلوب کو اختیار کیوں فرمایا

گیا؟[ب] اب آخری صورت یہ رہ گئی کہ یہ مان لیا جائے کہ ان کتب میں سرے سے کوئی استدلال تھا ہی نہیں۔مگر اس بات کی لغویت تو عین واضح ہے وہ ایسے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ان لوگوں سے تو کسی دلیل کے بغیر ہی وحی پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا جبکہ ہمارے لیے دلیلیں اتاری گئیں؟اس بات کو ماننے کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم یہ مان لیں کہ اس امت سے پہلے کے تمام لوگ بے وقوف اور عقل وخرد سے عاری تھے[حقیقت یہ ہے کہ ہمارے متجددین حضرات پس پردہ یہی سمجھتے ہیں خطبات اقبال کا بنیادی استدلال یہی ہے۔]اس آخری دلیل کے پیچھے جو نظریہ 'ارتقائے حیات انسانی' کارفرما ہے اب ہم مختصراً اس پر کچھ کلام کرنا چاہتے ہیں۔

۳] کیا نوع انسانیت ارتقاء کے عمل سے دوچار رہی ہے؟

اپنے تئیں تو یہ دعوی کہ انسانیت کا اجتماعی ذہن فکری اعتبار سے اپنے عہد طفولیت سے گزرتا ہوا رسالت محمدی ﷺ تک اپنے عہد شباب میں آ پہنچا تھا اور اس میں روز بروز ترقی کا عمل جاری وساری ہے بذات خود محل نزاع اور اسلامی نقطہ نگاہ سے گمراہ کن تصور ہے انشاءاللہ ہم کسی اور مضمون میں اس دعوے کی علمی بنیادوں کی تفصیلات اور گمراہیوں کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔یہاں محض اتنا اشارہ کیے دیتے ہیں کہ اس دعوے کی بنیاد ہیگل[Hegal] ڈارون[Darwin]اور سپنسر[Spenser]کے نظریہ ارتقاء [Theory of evolution]پر قائم ہے جس کی مختلف تعبیرات میں سے ایک مشہور تعبیر کارل مارکس[Karl Marx]نے بھی پیش کی ہے۔ان تمام تعبیرات میں کئی مختلف فیہ باتوں کے باوجود اس بات پر اتفاق ہے کہ:

☆ بنی نوع انسان بحیثیت مجموعی لاشعوری طور پر ایک ایسے عظیم الشان مقصد کی طرف رواں دواں ہے جہا ں پہنچنا اسکا مقدر ہے۔

☆ وہ مقصد انسانی تاریخ میں تحلیل ہوتا ہوا تسلسل کے ساتھ بنی نوع انسانیت کی زندگی کو ایسی راہوں پر ڈالتا رہا ہے جس کے نتیجے میں انسانیت بالآخر اس منزل تک جا پہنچے گی جہاں وہ مقصد اسے لے جانا چاہتا ہے اور جہاں پہنچ کر انسانیت کا یہ مسلسل سفر ختم ہو جائے گا، جسے تاریخ کے اختتام[End of History] سے تعبیر کیا جاتا ہے۔وہ مقصد اپنے حصول کے لیے انسانی زندگی کو ایک خاص عمل[process] سے گزارتا ہوا اپنی تکمیلی شکل کی سمت بڑھتا چلا جاتا ہے۔

☆ چونکہ ہر دور کا انسان حقیقت کا ادراک اسی خاص عمل کے اندر رہ کر ہی کرتا ہے جس سے وہ دوچار ہوتا ہے، لہذا ہر شخص حقیقت کا اتنا ہی ادراک حاصل کر سکتا ہے کہ جتنا اس دور تک اس مقصد اعلی نے خود کو اس عمل کے ذریعے انسانوں پر واضح کر دیا ہو۔حقیقت کا کامل ادراک انسان اسی روز حاصل کر سکے گا کہ جس دن یہ عمل اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا۔اس سے قبل ہر دور کے انسان کا تصور حقیقت اپنی انتہا کے اعتبار سے نامکمل ہی رہے گا۔

☆ گو کہ وہ مقصد کسی فرد کے اختیار سے بالاتر ہے لیکن اگر کوئی شخص مطالعہ تاریخ سے انسانی تاریخ کے عمل میں حلول کیے ہوئے اس مقصد کو جان لے تو وہ یہ بتا سکتا ہے کہ انسانیت کو اس مقصد کے جلد حصول کے لیے کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔

ہم خوب جانتے ہیں کہ نظریہ ارتقاء کا یہ مختصر سا نقشہ نا صرف یہ کہ سمجھنے کے لیے بہت مشکل ہے بلکہ اس کے تمام مضمرات کی وضاحت کرنے کے لیے قطعاً ناکافی ہے، البتہ اسلامی بنیادوں پر اس نظریئے کے بطلان کے لیے اس مقام پر اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ:

گمراہی ۳.۱ : اسلام کے بنیادی عقائد قابل تبدیل ہیں اور تبدیل ہوتے رہے ہیں

[الف] انسان کا اس کائنات اور اس کے خالق کے ساتھ تعلق نیز مرنے کے بعد زندگی وغیرہ جیسے بنیادی عقائد دین اسلام میں آدم علیہ السلام سے لیکر آج تک ہر امت میں یکساں رہے ہیں جسکا واضح مطلب یہ ہوا کہ ہر دور کے انسان کی فکری بنیادیں یکساں اصولوں پر استوار رہی ہیں اور ان حقیقتوں میں سے کسی میں رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ارتقاء کا نظریئے ماننے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہم یہ مان لیں آدم علیہ السلام کے دور میں اللہ نے انسانوں کی فکری رہنمائی کے لیے توحید، رسالت اور معاد کے علاوہ کسی اور عقائد کی تعلیمات دی تھیں۔ ظاہر ہے یہ ایک لغو بات ہے۔

گمراہی ۳.۲ : انسان کی اپنی حقیقت بھی قابل تغیر ہے

[ب] انسان کی حقیقت ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور وہ یہ کہ وہ اللہ کی 'مخلوق اور عبد' ہے۔ یہی وہ بنیادی تعلق ہے جس کی بنیاد پر اس دنیا میں اس کے تمام تعلقات استوار ہونے چاہئے۔ چنانچہ نظریہ ارتقاء کے درست ہونے کے لیے لازم ہے کہ ہم یہ بھی مانیں کہ ''انسان کیا ہے'' نیز اس 'دنیا میں اسکا کردار اور حیثیت کیا ہے' سب تبدیل ہوتے رہے ہیں۔

گمراہی ۳.۳ : وحی میں بیان کردہ انسان کا مقصد حیات بدلتا رہا ہے

[ج] آدم علیہ السلام سے لیکر آج تک بنی نوع انسانی کے ہر شخص کا واحد مقصد اپنے خالق کی خوشنودی حاصل کر کے خود کو جہنم کی آگ سے بچانا اور جنت میں داخل ہونا ہے۔ یہ مقصد انسانیت کا بحیثیت مجموعی نہیں بلکہ 'ہر فرد' کا علیحدہ علیحدہ ہے کیونکہ ہر فرد اپنے اعمال کے لیے اپنے رب کے حضور بذات خود جوابدہ ہے اور جوابدہی کا یہ تصور کسی قوم، ملک، طبقہ یا نسل کے اصول پر نہیں بلکہ ہر فرد کے اصول پر قائم ہے [کلھم اتیہ یوم القیامۃ فردا]۔ لہذا انسانیت کا بحیثیت مجموعی کسی مقصد کی طرف گامزن ہونیکا دعوی اسلامی نقطہ نگاہ سے ایک مبہم دعوی ہے بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ کسی دور کے انسان کا مقصد حصول رضائے الہی کے سوا کچھ اور بھی رہا ہے۔

گمراہی ۴.۳ : اصل علم کا ذریعہ وحی نہیں تاریخی عمل ہے

[د] جوابدہی کی اصل بنیاد کا ذریعہ علم مطالعہ تاریخ نہیں بلکہ وحی ہے جو اللہ اپنے خاص بندوں پر نازل کرتا ہے۔ چنانچہ ہر ایسا تخیلاتی مقصد حیات جس کی بنیاد وحی نہ ہو اللہ کے ہاں مردود ہے [من یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ]۔ تاریخی تسلسل میں کسی ایسے مقصد کا حلول ماننا جسکا ادراک عقل سے ممکن ہے دراصل حقیقت کے ادراک کے لیے سلسلہ نبوت کی اہمیت وضرورت سے انکار ہے۔ نیز انسانی ارادے سے ماوراء زندگی کے بہاؤ کا کسی مسلسل عمل [process] کے تحت ماننا درحقیقت انسانی زندگی کا رخ متعین کرنے میں نبی کے کردار سے بے اعتنائی کا دعوی ہے۔ اور انسانی زندگی کی تشکیل وتعمیر میں نبوت کے کردار اور اہمیت کا انکار ادراک حقیقت کے لیے وحی کی ضرورت کا انکار ہے۔

ہم پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ جب انسان اور اس کائنات کی حقیقت، انسان کا مقصد حیات اور ادراک حقیقت کا ذریعہ سب یکساں ہیں تو آخر یہ ارتقاء کس شے میں ہو رہا تھا؟ ان تمام وجوہ کی بنیاد پر نوع انسانیت کی فکر میں مسلسل اور بامقصد ارتقاء پر مبنی مفروضہ اسلام کے بنیادی حقائق کے مخالف ہے اس لیے قابل رد ہے۔

۴] قرآن کی سائنسی تفسیر کا اسلوب

یہی وہ خطرات ہیں کہ جنکی وجہ سے راسخ العلم علمائے حق نے ہمیشہ قرآن مجید کی سائنسی تفسیر کے منہاج کو ایمان کے لیے ایک پرخطر راہ قرار دیا ہے کیونکہ اس اسلوب میں درج بالا کے علاوہ کئی طرح کی گمراہیاں ایک ساتھ جمع ہیں جنمیں سے دو اہم تر ذیل ہیں:

گمراہی ۴.۱ : کائنات کے مافوق الفطرت حقائق کا انکار کرنا

[الف] ایک وقت ایسا بھی تھا کہ جب مغرب سے آنے والی خام سائنسی معلومات سے مرعوب ہو کر بعض لوگوں نے قرآن مجید کی واضح اور صریح تعلیمات کو ایسی ایسی تاویلات کی خراد پر چڑھایا کہ خدا کی پناہ۔ چنانچہ جس زمانے میں نیوٹن کے 'میکانکی نظریہ کائنات' [Mechanical world view] کا غلغلہ عام ہوا جس کے مطابق پوری کائنات علت ومعلول کے قانون میں اسطرح جکڑی ہوئی ہے کہ اس سے سر مو تجاوز نہیں کرسکتی تو لوگوں نے مافوق الفطرت حقائق کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ اب بعض مسلمان مفکرین کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ قرآن میں بیان کردہ معجزات [مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کا اثر نہ کرنا، آپ ﷺ کا بحالت بیداری آناً فاناً معراج کا سفر کرنا وغیرہ] تو اس سائنسی نظریئے سے میل نہیں کھاتے، لہذا انھوں نے اسلام کی عافیت اسی میں جانی کہ قرآن مجید کے الفاظ میں کسی طرح کھینچا تانی کر کے یہ ثابت کر دیا جائے ان معجزات کی کوئی مافوق الفطرت [super natural] حقیقت نہیں بلکہ یہ

عادی اسباب کے تحت ہی رونما ہوئے تھے۔ پھر بات صرف معجزات پر ہی ختم نہیں ہوئی، بلکہ جب آدم علیہ السلام کی پیدائش، شیطان کا انہیں سجدہ نہ کرنا، فرشتوں کا وجود اور انکا آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا، جنت دوزخ کا وجود وغیرہ حقائق بھی سائنسی نظریات سے ٹکراتے نظر آئے تو انہیں بھی تمثیلات کہہ کر انکی الٹی سیدھی تاویلات کر دی گئیں۔ اگر کوئی ان تاویلات فاسدہ کی تفصیلات جاننا چاہتا ہو تو صرف [سر] سید احمد خان کی تفسیر القرآن دیکھ لے کہ جس میں فرشتوں کو انسان کی مثبت صلاحتیں، جن اور شیاطین کو منفی جذبات، آدم علیہ السلام کو فرد کے بجائے نوع انسانی، جنت اور جہنم کو مقامات کے بجائے راحت وخوشی اور تکلیف ومصیبت کی انسانی کیفیات سے تعبیر کر کے ان اسلامی تصورات کی سائنسی نظریات سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ الغرض یہ کہ سائنسی علم کو معیار بنا کر قرآنی تعلیمات کو اس پر پرکھنا قرآن کے واضح اور صریح احکامات و تعلیمات کے انکار کا راستہ کھولتا ہے۔ خطبات اقبال میں جنت وجہنم کو مقامات کے بجائے کیفیات قرار دیا گیا ہے یہی نقطۂ نظر غلام احمد پرویز نے اختیار کیا۔ یہ نقطہ نظر نیا نہیں مسلم فلاسفہ کی تاریخ میں مل جاتا ہے۔

کیا دل بھی سوچتا ہے؟

آج کے دور میں اس رویے کی جھلک دیکھنا ہو تو قلب کی حقیقت پر مختلف مفکرین کی آراء پر غور کر لیجئے۔ قرآن میں کئی مقامات پر یہ بات دہرائی گئی ہے کہ بدکردار لوگوں کے قلوب پر مہر لگا دی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ چونکہ موجودہ سائنس یہ دعوی کرتی ہے کہ سوچنے کا عمل تو ذہن سرانجام دیتا ہے جبکہ دل تو محض خون کی روانی برقرار رکھنے کی ایک مشین ہے، لہذا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سائنسی تحقیقات کی روشنی میں قرآن کی ان آیات کا مطلب کیا ہوگا جن میں دلوں پر مہر لگانے کی بات کہی گئی ہے؟ جب لوگوں سے اس بات کا کوئی سائنسی جواب نہ بن پایا تو انھوں نے اس اعتراض کا حل نکالنے کی راہ یہ نکالی کہ عربی زبان میں قلب کا ترجمہ صرف دل ہی نہیں بلکہ 'ذہانت' [intellect] بھی ہوتا ہے۔ لہذا قرآن کی آیات کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی جاتی ہے، بلکہ یہ ہے کہ ان کی ذہانت پر مہر لگا دی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ حقیقت کے بارے میں سوچ نہیں سکتے۔ اس انوکھی تفسیر پر ایک اشکال یہ پیدا ہوا کہ قرآن میں تو کہا گیا ہے کہ قلب 'صدر' میں ہے [فانها لا تعمى الابصار ولكن تعمى القلوب التى فى الصدور: حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں] اور صدر کا معنی سینہ یا چھاتی ہوتا ہے۔ تو اگر قلب سے مراد ذہانت ہے [جس کا منبع ذہن ہوتا ہے]، اور ذہن سینے میں نہیں ہوتا، تو پھر قلب کے صدر میں ہونے کے کیا معنی ہونگے؟ اس کے جواب میں یہ کہہ دیا گیا کہ صدر کا معنی سینہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اسکا مطلب 'وسط' [centre] بھی ہوتا ہے، لہذا اب آیت کے معنی یہ ہوئے کہ تمہاری ذہانت [قلب] جو تمہارے وسط [صدر] میں ہے۔ اگر تفسیر کا

معیار عربی لغت ہی ٹھہرے،، پھر تو ہر باطل سے باطل نظریہ بھی لوگوں نے اسی قرآن سے ثابت کر دکھایا ہے۔اہل علم پر اس آیت میں صدر کے معنی وسط لینے کی معنوی بے ڈھنگی عین واضح ہے،لیکن سوال تو یہ ہے کہ ہمیں قرآن کی ایسی تاویل کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے جو احادیث، پوری اسلامی تاریخ، اسلامی علمیت اور روایت کو رد کرتی ہو؟ یہ تاویل اس قدر لغو ہے کہ اس پر کلام کرنا بھی تضیع اوقات ہے، البتہ چند اصولی باتیں ذیل میں بیان کر دی گئی ہیں: [الف] کیا سائنس کے پاس اس بات کا کوئی حتمی ثبوت ہے کہ سوچنے کا کام صرف ذہن ہی کرتا ہے؟ اگر کوئی کہے ہاں، تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ اسے سائنس کا کچھ علم ہی نہیں، وہ اسلیے کہ ہم نے پچھلے مضمون میں اس بات پر تفصیل سے روشنی ڈالی تھی کہ سائنس کے پاس علم حاصل کرنے کا ایسا کوئی طریقہ ہے ہی نہیں جس کے ذریعہ انسان کسی بات کو ثابت کر سکے۔[ب] یہ دعوی بھی اپنی جگہ غلط ہے کہ دل کا سوچنے کے عمل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، وہ اس لیے کہ علم نفسیات اور حیاتیات کی جدید تحقیقات کے مطابق دماغ اور دل میں ایک خاص نوعیت کا تعلق بہر حال موجود ہے۔فرض کریں کل کو یہ تحقیقات مزید آگے بڑھ کر یہ ثابت کر دیں کہ سوچنے کے عمل میں دل کا بھی کچھ عمل دخل ہے تو ہمارے مفکرین کیا کریں گے؟ کیا پھر قرآنی الفاظ کی نئی تفسیر کریں گے؟ کیا اس سے لوگوں کا ایمان قرآن پر سے متزلزل نہیں ہوگا؟ [ج] اگر تفسیر کے لیے سائنس ہی معیار و منہاج ہو تو پھر دل ہی کیا، سائنس تو روح کا بھی انکار کرتی ہے جبکہ قرآن و احادیث تو اس کے اثبات سے بھرے پڑے ہیں۔سوال یہ ہے کہ اب اس روح کے بارے میں ہمارے مفکرین کیا کہیں گے؟ انہیں چاہئے کہ یا تو اسکا انکار کر دیں یا پھر اس کی بھی کوئی نئی سائنسی توجیہہ کر دیں [جیسے ایک صاحب نے فرمایا کہ ہوسکتا ہے روح سے مراد وہی شے ہو جسے سائنس توانائی [energy] کہتی ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون]۔حق بات یہی ہے کہ جو لوگ سائنس کو بنیاد بنا کر قرآن کی تفسیر کرتے ہیں وہ اسی قسم کی عجیب وغریب باتیں کرتے ہیں جن کا اسلامی علمیت اور عقل وخرد سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا۔[د] لفظ قلب کی تعبیر ذہانت اور صدر کی وسط کرنے والوں نے یہ نہ سوچا کہ اس تعبیر کے بعد ان احادیث نبوی ﷺ کا کیا بنے گا جن میں قلب کو دل ہی کہا گیا ہے؟ مثلاً ایک مشہور حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ان الفاظ میں روایت ہوا ہے:

ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت، صلح الجسد کلہ، واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب

ترجمہ: بے شک جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے، اگر وہ اصلاح یافتہ ہو تو سارا جسم صالح ہوتا ہے، اگر گوشت کے اس لوتھڑے میں فساد پیدا ہو جائے تو سارا جسم مفسد ہو جاتا ہے۔جان لو وہ قلب ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اس حدیث میں قلب کے لیے لفظ مضغۃ استعمال کیا گیا ہے جسکا معنی

قریب قریب 'گوشت کا لوتھڑا' ہے۔ ظاہری بات ہے کہ ذہانت کو مضغة یعنی گوشت کا لوتھڑا کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا، بلکہ مضغة تو دل ہی ہوسکتا ہے۔ نیز یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ یہ دل ہی ہے جو گوشت کے لوتھڑے کی مانند ہوتا ہے نہ کہ ذہن، جس سے صاف معلوم ہوا کہ اس حدیث میں قلب دل ہی کو کہا گیا ہے۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے تقوے کے مقام کے بارے میں اپنے سینہ مبارک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ التقوی ھھنا 'تقوی یہاں ہوتا ہے [یعنی دل میں]۔ ایسے ہی ایک اور روایت میں بیان ہوا کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے فرمایا کہ مجھے اپنی جان آپ ﷺ سے زیادہ عزیز محسوس ہوتی ہے تو آپ ﷺ نے انکے سینہ مبارک پر ہلکا سا ہاتھ سے جھٹکا دیا جس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اب یہ کیفیت بدل گئی ہے اور آپ ﷺ کی محبت اپنی جان سے بھی بڑھ گئی ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ سینے پر ہاتھ کیوں مارا؟ اگر قلب سے مراد ذہانت ہوتی تو سر پر ہاتھ مارنا چاہئے تھا۔ اسی طرح ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ جب کوئی مومن ایک گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ نشان ڈال دیا جاتا ہے۔ اگر تو وہ توبہ کرلے تو وہ سیاہ نشان مٹا دیا جاتا ہے، اور اگر وہ مزید گناہ کرتا ہی چلا جائے تو وہ سیاہ نشان بھی بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اسکا پورا قلب سیاہ ہوجاتا ہے اور پھر اس سے توبہ کی توفیق سلب کرلی جاتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قلب سے مراد ذہن ہے تو اس پر سیاہ نشان کے کیا معنی ہوئے؟ نیز کیا سائنس اس بات کو مانتی ہے کہ کہ گناہ کے کام کرنے سے کسی شخص کی ذہانت یا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کم ہوجاتی ہے؟ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ کافر، گناہ گار اور فاسق و فاجر قسم کے لوگوں کی ذہانت کے چرچے بھی چہار دنگ عالم میں عام ہیں۔ مثلاً آئن سٹائن مشہور سائنس دان ہے جس کی ذہانت بھرے سائنسی نظریات نے فزکس کی دنیا میں تہلکہ مچا کر رکھ دیا ہے، لیکن اسکا کردار اور زندگی کس قدر غیر اخلاقی تھی اسکا اندازہ اس کے ان خطوط سے لگایا جاسکتا ہے جو اس کی پوتی نے شائع کیے [انہیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنی بیوی کے سوا تمام عورتوں سے تعلقات رکھتا تھا] اسی طرح کانٹ اتنا ذہین آدمی تھا کہ پچھلے تین سو سال میں پورے مغربی فکر و فلسفے میں اس پائے کا فلسفی آج تک پیدا نہیں ہوا، لیکن وہ اغلام باز تھا۔ اسی طرح بیسویں صدی کا مشہور ترین فلسفی فوکو [Focault] ایڈز کی بیماری میں مبتلا ہوکر ہلاک ہوا۔ یہ محض چند مثالیں ہیں، ورنہ اگر آپ دنیا کے اکثر و بیشتر 'ذہین' ترین سائنسدانوں وغیرہ کی زندگی کا مطالعہ کر کے دیکھیں گے، تو اکثر و بیشتر کی زندگیاں اخلاق رزیلہ نجاست اور تعفن سے بھری ہوئی دکھائی دے گی۔ سوال یہ ہے کہ ایسے گناہ گار لوگ پھر اتنے ذہین کیوں ہیں؟ یہ چند احادیث تو برجستہ ہی بیان کردی گئی ہیں ورنہ اگر کتب احادیث کو بغور پڑھا جائے تو اس موضوع پر دسیوں احادیث پیش کی جاسکتی ہیں۔ اب ایک طرف یہ احادیث ہیں جو در حقیقت قرآن مجید کی اصل شارح ہیں، دوسری طرف وہ الل ٹپ لغوی تاویلات ہیں جو ہمارے مفکرین

حضرات بیان کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ ان میں سے کس کی بات مانی جائے؟ ظاہر بات ہے کہ احادیث کے سامنے ایسی لغوی بحثوں اور ظنی [speculative] سائنسی اصولوں کی حیثیت مکھی کے پر جتنی بھی نہیں۔

[ھ] فرض کریں کہ ہم ایک لمحے کے لیے یہ دعوی مان لیتے ہیں کہ سوچنے کا کام ذہن ہی کرتا ہے دل نہیں کرتا، تب بھی قرآنی اصطلاح 'قلب' کی کوئی نئی تاویل کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اس لیے کہ حقیقت کا ادراک عقل کے بس کی بات ہی نہیں [اس بات کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں]۔ عقل کی پرواز تو صرف وہاں تک ہے جہاں تک حواس خمسہ سے حاصل ہونے والے مشاہدات وتجربات اسے لے جا سکتے ہیں، اور اس دنیا میں مابعد الطبعیاتی حقائق [مثلاً ذات باری تعالی، مقصد انسانی، زندگی بعد الموت وغیرہ] پر کوئی مشاہدہ ممکن ہی نہیں کہ جس کے ذریعے ان حقائق کے حوالے سے عقل کوئی رائے قائم کر سکے۔ لہذا حقیقت کا ادراک سرے سے عقل کے ذریعے ممکن ہی نہیں، بلکہ اسکا ذریعہ تو قلب ہے۔ قرآن وحدیث نے حقیقت کے ادراک کے لیے اسی قلب کی پاکیزگی اور تطہیر کی جانب اصل توجہ دلائی ہے اور اگر کسی کو قلب کی دنیا کے حالات جاننے کا شوق ہو تو حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی کتاب **احیاء العلوم الدین** کی تیسری اور چوتھی جلد پڑھ لے۔

پس جاننا چاہئے کہ درست طریقہ تفسیر یہی ہے کہ ہم قرآن مجید کو ہی بنیاد بنا کر باقی نظریات کے حق یا باطل ہونے کا فیصلہ کریں کیونکہ قرآن ہی اصل 'معیار اور علمیت [episteme ú] ہے اور اس حقیقت کو قرآن نے اپنے لیے فرقان [حق و باطل میں فرق کرنے کا معیار و میزان] اور **الحق** [واحد اور اصل حقیقت] کے الفاظ کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی قرآن خود آخری اور حتمی معیار اور میزان علم ہے جسمیں تول کر ہر نظریئے کی حقانیت کو جانچا جانا چاہیے۔ بھلا ہو مولانا احمد رضا خانؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ، پیر مہر علی شاہؒ، سید جماعت علی شاہؒ، مولانا محمود الحسنؒ، سید احمد سعید کاظمیؒ، مولانا شفیع عثمانیؒ، پیر کرم شاہ الازہری [رحمہم اللہ اجمعین] اور ان جیسے اور علماء اور صوفیاء کرام کا جنہوں نے زمانے کے عام چلن سے مرعوب نہ ہو کر حق کی وہی تعبیر اختیار کیے رکھی جو صحیح روایات کے ساتھ اسلاف سے ثابت ہے۔ اگر یہ حضرات نے بھی زمانے کے عام چلن کے مطابق خام سائنس سے مرعوب ہو کر قرآن کی غلط سلط تاویلات عوام میں عام کر دیتے تو سائنس کی دنیا میں نیوٹن کے نظریئے کے ابطال کے بعد عوام الناس کا قرآن مجید کی حقانیت سے ایمان جاتا رہتا [اس کی ایک مثال آگے آئے گی]۔

گمراہی ۳.۳ : قرآن کے موضوع کو خلط ملط کر دینا

[ب] قرآن کی سائنسی تفسیرات کے ضمن میں ایک عام گمراہی الفاظ قرآنی کی دور از کار تاویلات کر کے فی زمانہ مروج سائنس کے ہر مشہور نظریئے کو قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کرنا بھی شامل ہے۔ اس سعی کے پیچھے یہ مفروضہ کارفرما ہے کہ قرآن مجید سے کسی سائنسی نظریئے کا ثابت نہ ہوسکنا گویا

F:\Shah\November 2006\SCIENCE_AND_ISLAM_for_Sahil

قرآن کے لیے ایک قسم کا عیب ہے۔لہذا ڈارون کے حیات انسانی کے نظریہ ارتقاء، کائنات کی ابتداء کی بگ بینگ تھیوری[Big Bang Theory]، نیز زمین کی حرکت وسورج کی مرکزیت سےلیکر ایٹم بم تک کے نظریات قرآن سے نکالے جارہے ہیں اور ایسا کرنے میں ہی اسلام کا بھلا سمجھا جارہا ہے۔اس قسم کے تفسیری شاہکار خصوصاً مصر کے علامہ طنطاوی کی تفسیر الجواھر میں دیکھے جاسکتے ہیں، جس کے بارے میں علماء کی رائے یہ ہے کہ اس کتاب میں سوائے قرآن کی تفسیر کے اور سب کچھ ہے۔اس طرز تفسیر کے مضمرات و نقصانات کا اندازہ اس تاریخی حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس وقت دنیا میں یہ نظریہ عام تھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے تو چرچ نے اس عقیدے کو عیسائی ایمانیات کا لازمی حصہ بنا کر اسے بائبل کے ساتھ منسوب کردیا۔اس عقیدے کو اپنانے کی وجہ یہ نہ تھی کہ بائبل میں اس کے بارے میں کوئی واضح تعلیم دی گئی تھی، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ عقیدہ چرچ کے اس تصور کے ساتھ مناسبت رکھتا تھا کہ چونکہ خدا کا بیٹا اس زمین پر تشریف لایا، لہذا زمین ہی کائنات کا مرکز بھی ہونی چاہئے۔البتہ جب سائنس کی دنیا میں کوپرنیکس [Copernicus] کے اس نظریئے کو مقبولیت حاصل ہوئی کہ کائنات کا مرکز زمین نہیں بلکہ سورج ہے اور زمین اس کے گرد چکر لگاتی ہے تو عیسائی دنیا کا ایمان بائبل سے جاتا رہا۔اس ناقابل تلافی نقصان کی اصل ذمہ دار بائبل نہیں بلکہ چرچ کا ناعاقبت اندیشانہ رویہ تھا جس نے ایک ایسی بات کو بائبل کی طرف منسوب کیا جس کی اس میں کوئی تعلیم نہیں دی گئی تھی اور اس رویے کا نقصان سائنس کو نہیں بلکہ عیسائیت کو ہوا۔جلتی پر تیل ڈالنے کا کام چرچ کے ان مظالم نے کیا جو بعض ملحد قسم کے سائنس دانواں پر توڑے گئے۔اس ردعمل کے بجائے اگر چرچ اپنی علمی غلطی کا اعتراف کر کے یہ اعلان کردیتا کہ بائبل کے ساتھ مرکزیت زمین کے نظریئے کو منسوب کرنا غلط ہے تو شاید نا عیسائی مذہب کو ناقابل تلافی نقصان نہ پہنچتا اور نہ چرچ اور پوپ کے کردار کو تاریخ میں محض ایک برائی کے طور پر رقم کر کے مسخ کیا جاتا۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا کہ قرآن کی سائنسی تفسیر کے پیچھے یہ غلط مفروضہ کارفرما ہے کہ کسی سائنسی نظریئے کا قرآن سے ثابت نہ ہونا قرآن کے لیے ایک عیب ہے۔درحقیقت یہ مفروضہ قرآن کے اصل موضوع کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔قرآن کوئی سائنس کی کتاب نہیں کہ جسمیں فزکس، کیمسٹری، حیاتیات وغیرہ کی تفصیلات بیان کی گئی ہوں بلکہ قرآن کا اصل موضوع نوع انسانیت کی اس راستے کی طرف ہدایت کرنا ہے جس پر عمل پیرا ہو کر وہ اپنے رب کے حضور سرخرو ہوسکے۔چنانچہ کسی سائنسی نظریئے کا قرآن میں نا ہونا کوئی عیب نہیں کیونکہ یہ قرآن کا موضوع ہی نہیں۔اگر کوئی شخص قانون کی کسی کتاب میں کسی سائنسی ایجاد کی وجہ سے پیدا ہونے والی قانونی پیچیدگیوں کی تفصیلات دیکھ کر یہ طے کرلے کہ وہ سائنس کا ہر نظریہ اس کتاب سے نکالے گا تو ایسے شخص کی عقل پر ہر شخص ماتم کرے گا اور اس سے یہی کہے گا کہ بھائی یہ قانون کی

کتاب ہے نا کہ سائنس کی نیز اس میں اگر کوئی سائنسی بات زیر بحث لائی بھی گئی ہے تو اسے قانون ہی کے موضوع کے تحت سمجھنا چاہیئے۔جس طرح قانون کی کتاب میں طب، فزکس، کیمسٹری کی تفصیلات کا نہ ہونا کوئی عیب نہیں ایسے ہی قرآن میں سائنسی بیانات کا نہ ہونا کوئی عیب نہیں۔ نیز جس طرح کسی قانون کی کتاب میں کسی سائنسی ایجاد یا تاریخی واقعے کے درج ہونے سے وہ سائنس یا تاریخ کی کتاب نہیں بن جاتی ، بالکل اسی طرح قرآن میں کسی سائنسی حقیقت کی طرف ضمناً اشارہ آ جانے سے قرآن سائنس کی کتاب نہیں بن جاتی بلکہ اس بیان کی صحیح تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ اسے قرآن کے عمومی موضوع کے تحت ہی سمجھا جائے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے قرآن میں ماضی کی کئی امتوں کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے، اب اگر کوئی شخص قرآن کو تاریخ کی کتاب سمجھ لے اور اس میں ساری انسانیت کے تاریخی واقعات تلاش کرنا شروع کردے تو وہ سخت غلطی کا مرتکب ہوگا کیونکہ قرآن جب کسی ماضی کے واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے تو بطور تاریخی حوالے کے نہیں بلکہ بطور ہدایت [نصیحت، عبرت، ہمت وصبر پیدا کرنا وغیرہم] کرتا ہے اور اسی پس منظر میں رہ کر ہی ان واقعات کی درست تفہیم ممکن ہے۔مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کا طویل قصہ بیان کرنے کے بعد سورہ یوسف کی آخری آیت میں قرآن کہتا ہے:

لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الباب [اگلے لوگوں کے ان واقعات میں ہوش مندوں کے لیے عبرت ہے]

ایسے ہی کسی سائنسی بیان کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اس میں عقل اور ایمان والوں کے لیے اللہ کی نشانیاں ہیں یا اس میں عقل والوں کے لیے عبرت کا سامان ہے وغیرہ۔ دوسرے لفظوں میں قرآن کا کسی سائنسی حقیقت کو بیان کرنے کا مقصد ہرگز کسی سائنسی نظریئے کی داغ بیل ڈالنا، لوگوں کو سائنس سکھانا یا انسانوں کو تسخیر کائنات پر ابھارنا نہیں ہوتا، بلکہ ہدایت انسانی کی خاطر اسے ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے جس پر غور کرکے وہ اصل حقیقت تک پہنچ کر خود کو اپنے رب کے حضور جھکا دے۔

یہ چند باتیں اختصار کے ساتھ اہل علم کی خدمت میں عرض کی گئی ہیں۔کوئی ہرگز اس احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو کہ سائنس کو قرآن سے علیحدہ کرنے سے خدانا خواستہ معجزنما قرآن کی شان کم ہو جائے گی، بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ سائنسی علم کی حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر ہمارے مفکرین نے سائنس کو اسلامیانے کی خاطر جو دعوے تراش رکھے ہیں وہ مغربی سائنس کی تاریخ سے تو میل کھاتے ہیں، مگر تاریخ انبیاء اور قرآن کی بنیادی تعلیمات سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتے۔ نیز سائنسی علم کو قرآنی علوم میں جگہ دینا گویا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی پاک، صاف اور شفاف پانی کی نہر میں کہیں دور دراز سے ایک گدلے پانی کا پرنالہ گرانا شروع کردے۔ہمیں اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ہمارے مفکرین کی ایسی تمام سعی

اور کوششیں خلوص نیت پر ہی مبنی ہیں، لیکن صرف خلوص نیت کسی بات کے صحیح ہونے کا معیار نہیں بن سکتا، جیسے کسی ماں کا کتنے ہی خلوص اور محبت کے ساتھ اپنے بچے کو زہر پلا دینا بچے کے لیے تریاق نہیں بن سکتا۔

چند غور طلب سوالات

آخر میں ان حضرات سے جو سائنس کو اسلامیانے کے حق میں دلائل فراہم کرنے کا کام سرانجام دے رہے ہیں ہم چند سوالات پوچھنا چاہتے ہیں۔

۱] کیا ابتدائی تیرہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں کسی معتبر مفسر، فقیہ یا عالم نے قرآن اور سائنس کے تعلق پر کوئی بحث کی ہے؟ اگر نہیں، تو اس کی وجہ کیا ہے کہ کسی بھی معتبر شخص کو آپ کے بقول سائنس جیسی عظیم الشان علمیت کی ہوا بھی نہ لگی؟

۲] کیا ابتدائی تیرہ سو سالہ اسلامی نظام تعلیم میں سائنسی مضامین کو وہ اہمیت حاصل تھی جو اب ہمارے معاشروں میں ہے؟ کیا مسلمانوں نے کبھی تسخیر کائنات اور سرمائے کے مسلسل اضافے کو اپنے نظام تعلیم کی بنیاد اور مقصد بنایا؟

۳] اگر نہیں، تو مسلمانوں کے نظام تعلیم کا مقصد کس قسم کی شخصیت اور معاشرت کی تعمیر کرنا تھا؟ کیا اس شخصیت کی تعمیر کے لیے تسخیر کائنات کو بطور مقصد حیات کے قبول کرنا ضروری امر ہے؟

۴] اگر سائنس حقیقت کے ادراک کا ایسا ہی ذریعہ علم ہے جس کے نتائج بعینہ وحی سے مطابقت رکھتے ہیں تو آج تک لاکھوں سائنس دانوں میں سے کتنے ایمان کی دولت سے مالا مال ہوگئے؟ کیا مغرب نے سائنسی علم کی بنیاد پر جو معاشرہ قائم کیا ہے وہ آہستہ آہستہ مذہبی اقدار سے قریب تر ہو رہا ہے یا دور؟

۵] کیا تسخیر کائنات کو بطور مقصد حیات کے قبول کیے بغیر بھی سائنس و ٹیکنالوجی کا موجودہ عروج ممکن ہے؟ کیا ماضی میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے؟ اگر جدید سائنس کا سرمایہ داری سے تعلق ختم کر دیا جائے تو کیا یہ سائنس ایک دن بھی زندہ رہ سکتی ہے کیا جدید سائنس اور سرمایہ داری لازم وملزوم ہیں یا نہیں؟ کیا اربوں کھربوں روپے کا یہ سرمایہ یورپی ممالک نے خود پیدا کیا یا نوآبادیات سے لوٹ کر سائنسی انقلاب برپا کیا گیا؟ کیا خطیر سرمایہ کے بغیر کسی ایک سائنسی ایجاد کا امکان ہے؟ اگر نہیں تو یہ کھربوں روپے کہاں سے آئیں گے؟

یہ ان اہم سوالات میں سے چند ایک ہیں جنکا جواب دیئے بغیر سائنس کو اسلامی تاریخ میں تلاش کرنا بے شک ایک سہل طریقۂ تحقیق اور اپنے نفس کو خوش کرنے کا ذریعہ تو ہوسکتا ہے مگر اس طریقۂ تحقیق سے حاصل ہونے والے نتائج تخیلاتی اور مہمل قسم کے دعوں پر ہی مبنی ہونگے۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اصل حقیقت [معرفت الہی] سے روشناس کرائے۔ آمین یارب العالمین